

بُری بُری کی جمالیات

شکیل الرحمن



میر تقی میر کی جماليات

شکیل الرّحمن

MEER TAQI 'MEER' KI JAMALIYAT

By

SHAKEELUR REHMAN

2011

Rs. 200/-

Distributor

NIRALI DUNIYA PUBLICATIONS

358-A, Bazar Delhi Gate, Darya Ganj, New Delhi-110002

Mobile: 0-9811270387

میر تقی میر کی جمالیات

شکیل الرحمن

تقسیم کار

نرالی ڈنیا پبلیکیشنز

110002، 358-A، بازارِ دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

موباں: 0-9811270387

© جملہ حقوق بحق عصمت شکیل محفوظ

م敦وبن، A-267، ساؤ تھٹھی-1

گرڈ گاؤں-122001 (ہریانہ)

دوسری اشاعت : 2011ء

تعداد : 500

قیمت : دوسرو پے

کمپیوٹر نگ

سرور ق

طباعت : www.shahinasgallery.com

ناشر : عرفی پبلی کیشنز

م敦وبن، A-267، ساؤ تھٹھی-1، گرڈ گاؤں-122001 (ہریانہ)

Website: www.shakeelurrehman.com

email : shakeelrehman2001@hotmail.com

زیرِ اهتمام

شخیر احمد

مانے کے پتے:

○ نرالی دُنیا پبلی کیشنز، A-358، بازار دہلی گیٹ، دریائی گنج، نئی دہلی-110002

○ مکتبہ جامعہ لمبید، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

○ انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز الیونیو، نئی دہلی-110002

○ موزران پبلیشنگ ہاؤس، 9- گولام کیٹ، دریائی گنج، نئی دہلی-110002

○ عرفی پبلی کیشنز، م敦وبن، A-267، ساؤ تھٹھی، گرڈ گاؤں-122001 (ہریانہ)

محترم علی سردار جعفری کے نام

جو

اس دور کے

سب سے ممتاز

میر شاہس ہیں

برسون مارے چرخ فلک تو ایسے ہو ویں پیدا لوگ

— شکیل الرحمن

کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرا
ڈوبا، ہی جائے ہے لوہو میں سرخار ہنوز

میر

میر تقی میر شرِ نگار رس، کے ایک ممتاز شاعر ہیں!

ہندوستانی جمالیات میں 'شرِ نگار رس' تمام رسول کا سرچشمہ تصور کیا گیا ہے، یہ رس محبت اور غم کے جذبوں سے پیدا ہوتا ہے اور فن میں ان جذبوں کا جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔

'عشق' ہی محبت کے جذبے کا جمالیاتی تجربہ ہے، عشق ہی 'شرِ نگار رس' کا مرکز ہے، اسی کے تحریک سے یہ رس ابلتا ہے، اپنی شیرینی اور مٹھاس عطا کرتا ہے، غنا کی لیے ہوئے یہ رس قاری کے جذبے کو صرف متاثر ہی نہیں کرتا بلکہ قاری کے باطن میں 'کتھارس' کی کیفیت بھی پیدا کر دیتا ہے، شعور، احساس، تخيّل سب متاثر ہوتے ہیں۔

'شرِ نگار رس' کی اصطلاح کے متعلق ایک خیال یہ ہے کہ اس کا تعلق 'شر' (Sr) سے ہے جس کے لغوی معنی ہیں 'مارنا'، 'مار دینا'۔ مفہوم Himsayam ہے "اس شخصیت کا خاتمه کہ جسے عشق کا تجربہ حاصل ہوا!"، مطلب یہ ہے کہ جس نے عشق کیا، جو محبت میں گرفتار ہوا وہ ختم ہو گیا، عشق ختم کر دیتا ہے، مارڈالتا ہے!

معروف عالم جمالیات ابھی نو گپت نے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ لفظ 'شرِ نگار' دراصل 'سرِ نگا' (Smga) سے نکلا ہے کہ جس کا مفہوم ہے "جس کا گہرا اثر" سیکس، کی جلت پر ہو!۔ وہ تجربہ جو عشق سے حاصل ہوا اور سیکس، کی جلت کو متاثر کرے وہی شرِ نگار ہے! دونوں مفہوم اہم ہیں۔ دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، لفظ جہاں کا بھی، جس طرح بھی پھوٹا ہو دوں مفہوم مل کر شرِ نگار کی اصطلاح کی معنویت میں کشادگی پیدا کر دیتے ہیں۔ غزل کے پیشِ نظر 'شرِ نگار' کے دونوں مفہوم بلاشبہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میر تقی میر کی

غزل ترپتے ہوئے، زخمی، قتل ہوتے، عشق کے مارے ہوئے عاشق کی بھی کہانی ہے اور عشق اور جنس کی جالت کی کشش اور ان کی جانب جھکاؤ کا بھی فسانہ ہے۔

عشق دُشِرِ نگار کا بنیادی جذبہ ہے اور میر کی شاعری عشق کے جذبے کی ایک ایسی شاعری ہے کہ جسے ٹھٹھک کر دیکھتے رہنے کی خواہش ہوتی ہے۔ میر کا تجربہ بھی یہی ہے کہ عشق ختم کر دیتا ہے، جو محبت میں گرفتار ہوا وہ گیا:

پہلے دیوانے ہوئے پھر میر آخر مر گئے
ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

آشنا ہواں سے ہم مر مر گئے آئندہ میر
جیتے رہئے، تو کو سے اب نہ یاری کیجیے
حیراں گم سم پیکر کی یہ تصویر دیکھئے:

خدا جانے کہ دل کس خانہ آباداں کو دے بیٹھے
کھڑے تھے میر صاحب گھر کے دروازے پہ حیراں سے
عشق کیا اور جہاں سے گزر گئے:

رفتہ عشق کیا ہوں میں اب کا
جاپکا ہوں جہاں سے کب کا
چراغ گور کی مانند تہا جلتے رہے:

گوبے کسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا
میں جوں چراغ گور اکیلا جلا کیا
منظردیکھئے اور گفتگو کا انداز ملاحظہ کیجیے:

قتل کیے پر غصہ کیا ہے لاش مری اٹھوانے دو
جان سے بھی ہم جاتے رہے ہیں، تم بھی آؤ جانے دو

عشق میں محبوب دل کیجہ نکال لیتا ہے:

جس کا خواب خیال لیتے ہیں

دل کیجہ نکال لیتے ہیں

میر کے کلام میں ایسے تجویں کے جانے کتنے اشعار ہیں۔ چند اشعار اور سنئے، ایسے تجویں کا اظہار کتنے خوبصورت انداز میں کیا ہے:

ہزار بار گھری بھر میں میر مرتے ہیں

انھوں نے زندگی کا ڈھب نیا نکالا ہے

عاشقی جی ہی لے گئی آخر

یہ بلا کوئی ناگہانی تھی

جور کیا کیا ، جفائیں کیا کیا ہیں

عاشقی میں بلاعیں کیا کیا ہیں

محبت نے کھویا کھپایا ہمیں

بہت ان سے ڈھونڈا ، نہ پایا ہمیں

مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگانِ عشق

ہے میر راہ و رسم دیارِ وفا کچھ اور

فرہاد و قیس و میر ، یہ آوارگانِ عشق

یونہی گئے ہیں، سب کی رہی من کی من کے بیچ

کچھ زرد زرد چہرہ ، کچھ لا غری بدن میں

کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحانے مرنے کا مزا جانا

کہتا تھا میر حال تو جب تک تو تھا بھلا
کچھ ضبط کرتے کرتے ترا حال کیا ہوا

میرے تغیرِ حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

از خویش رفتہ اس بن رہتا ہے میر اکثر
کرتے ہو بات کس سے، وہ آپ میں کہاں ہے

غالب کہ یہ دل خستہ شبِ ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے

کہہ، سانجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک
جیسے چراغِ مفلس، اک دم میں جل بجھا تو

کاسہ سر کو لیے مانگتا دیدار پھرے
میر وہ جان سے بیزار گدا میں ہی ہوں

نشر نگاڑ کے دوسرے مفہوم کے پیش نظر یہ اشعار سنئے:

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

گل کو محبوب ہم نے قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

میر کیا بات اس کے ہونٹوں کی
جینا دو بھر ہوا مسیح پر

چاہتا ہے جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں
نازِ بیجا بھی نہ ہو وے کم نگاہی بھی نہ ہو

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کیا چہرہ تجھ سا ہو گا اے آفتاب طلعت
منہ چاند کا جو ہم نے دیکھا تو چھائیاں ہیں

گزرائیں اس سلوک سے دیکھانہ کر مجھے
برچھی سی لاغ جا ہے جگر میں تری نگاہ

شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ
جب سوئے تو چادرِ مہتاب تائیں

کیا صورت ہے، کیا قیامت ہے، دست و پا کیا نازک ہیں
ایسے پتلے منہ دیکھو جو کوئی کلال بنادے گا

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوه ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

اس گلِ تر کی قبا کے کہیں کھولے گا بند
رنگوں گلِ برگ کے ناخن ہے معطر اپنا

اس سے یوں گل نے رنگ پکڑا ہے
شمع سے جیسے لیں چراغ لگا

ہلتی ہے یوں پلک کہ گڑی دل میں جائے ہے
انداز دیدنی ہے مرے دل نواز کا

اس لطف سے نہ غنچہ نرگس کھلا کبھو
کھلنا تو دیکھ اس مژہ نیم باز کا

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

نقشِ قدم سے اس کے گلشن کی طرح ڈالی
گرد رہ اس کی لے کر سرو روای بنایا

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقاش سہل
چاند سارا لگ گیا تب نیم رُخ صورت ہوئی

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہہ جس کی پیرا ہن پہ ہے

اتنی سڈول دیہی دیکھی نہ ہم سنی ہے
ترکیب اس کی گویا سانچے میں گئی ہے ڈھالی

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چوی بھیکے پسینے میں

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

لکنت تری زبان کی ہے سحر جس سے شوخ
یک حرفاً نیم گفتہ نے دل پر اثر کیا

میرا دانت ہے تیرے ہونٹوں پہ مت پوچھ
کہوں گا تو لڑنے کو تیار ہوگا

وہ نہانے لگا تو سایہ زلف
بحر میں تو کہے کہ جاں پڑا

میر دیکھو گے رنگ نرگس کا
اب جو وہ مت خواب نکلے گا

گل شرم سے بہہ جائے گلشن میں ہو کر آب سا
برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا

اب رشک حنائی سے جو تر نہ کرے مژگاں
وہ تجھ کف رنگیں کا مارا نہ ہوا ہو گا

ستھرائی اور نازکی گلبرگ کی درست
پردیسی بو کہاں کہ جو ہے اس بدن کے پیچ

گل پیر ہن نہ چاک کریں کیونکہ رشک سے
کس مرتبے میں شوخ ہے اس کی قبا کا رنگ

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

چاہیں تو تم کو چاہیں، دیکھیں تو تم کو دیکھیں
خواہش داول کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم

ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشک یا سمن
کم گوشہ چمن سے ترا رہ گزر نہیں

صحیح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کومول لیا قیامت سے سرو غلام کیا

‘شرِنگارس’ کی تازگی لیے ہر شعر اردو زبان کا خوب صورت شعر ہے۔ میر کا احساس حسن بھی متاثر کرتا ہے اور اس کی رومانیت بھی شدت سے متاثر کرتی ہے۔ حسن کا گمرا احساس لیے رومانیت ‘شرِنگار’ کی روح اور اس کا جو ہر ہے۔ جانے پہچانے اور بعض پرانے روایتی تجربوں میں بھی اس رس کی وجہ سے تازگی اور نیاپن ہے۔ میر کی کلاسیکیت حسن میں ایک تنظیم پیدا کرتی ہے اور ان کی رومانیت اس میں اجنیت پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلام میر سے زیادہ سے زیادہ جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ میر تجربوں کی شدت عطا کرنے اور جذبوں سے لطف اندوز کرنے کی بڑی صلاحیت رکھتے ہیں۔

عورت اور مرد کی محبت کی شدت اور ان کی جذباتی کیفیتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ سب جو جمالیاتی تجربے اصل کرتے ہیں انھیں محسوس بھی کرتے ہیں لیکن سب ان کا فنکارانہ اظہار تو نہیں کر سکتے۔ تخلیقی فنکار ہی ان جمالیاتی تجربوں کو ایسے ڈرامائی اور تمثیلی انداز میں پیش کرتا ہے کہ ان کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ اس حد تک کہ وہ اپنی تازگی لیے زندہ رہتے ہیں۔ فنکار کے ذہن کی شادابی انھیں زندگی بخش دیتی ہے، شرنگار رس لیے ہوئے ایسے تمام تجربوں میں میر کے تخیل کی شادابی متاثر کرتی ہے، اسی شادابی کا کرشمہ ہے کہ اکثر تحریر بھی پیدا ہوتا ہے، محسوس ہوتا رہتا ہے کہ ہمیں جو جمالیاتی انبساط اصل ہو رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ فنکار کے تحت الشعور میں انبساط اور شادمانی موجود ہے۔ اشعار کی سادگی اور پرکاری اور لمحے کے معصوم اور پاکیزہ انداز سے ڈرامائی کیفیت اور پرکشش ہو جاتی ہے۔ میر کی جمالیات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عشق و محبت کے جمالیاتی تجربوں میں بار بار ایسی اٹھان پیدا ہوتی ہے کہ زبردست جمالیاتی مرت حاصل ہوتی ہے۔ اکثر وجد اور کیف کی عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اردو کی عشقیہ شاعری میں روحانی سرور اور وجد کیف (Exaltation) کی ایسی مثال بہت کم ملتی ہے، جو اشعار پیش کیے گئے ہیں انھیں پڑھتے ہوئے

آپ کو یقیناً محسوس ہو گا کہ عشقیہ تجربوں کی جمالیاتی سطح صرف اس لیے بلند ہوتی ہوئی ہے کہ میر صاحب حسن کا شدید احساس رکھتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس احساس کو لفظوں میں فنکارانہ انداز میں ڈھال بھی دیتے ہیں، محظوظ کے گیسو ورخار، اس کے بدن کارنگ، چپاں لباس، قامت، ہونٹ، سڑوں جسم، پسینے میں بھیگی چولی، کفر نگیں، زبان کی لکنت، سایہ زلف، برچھی جیسی نگاہ، جسم کی خوشبو، جادو بھرے ہونٹ، چاندی کی طرح سفید روشن ہاتھ، انداز نظر۔ یہ سب بڑی دلاؤیزی اور نفاست لیے ہوئے ہیں، بانکپن کے ساتھ تیکھا پن بھی توجہ طلب ہے۔ محظوظ کے جسم کا مشاہدہ انتہائی لطیف اور دلاؤیز جمالیاتی تجربے پیش کرتا ہے۔ ہر شعر شرنگار رس میں ڈوبا ہوا ہے اور فنکار کے ذہن کی نیرنگیوں کے ساتھ جمالیاتی انبساط عطا کرتا ہے۔ ”شنگار رس“ کے تجربوں کے عمدہ معیار کی پہچان ان اشعار سے بھی ہوتی ہے:

فروغِ اس کے چہرے کا تھا پردہ در
ہوا کیا جو ہم نے بجھائی تھی شمع

نازکی اس کے لب کی کیا کہنے
پکھڑی اک گلاب کی سی ہے

نظر دزدیدہ کرتے ہو جھکی رکھتے ہو پلکوں کو
لگی ہوتیں نہ آنکھیں تو نہ آنکھوں کو چھپاتے ہم

کھانا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیمِ خوابی سے

دیکھ کے دست و پائے نگاریں چپکے سے رہ جاویں نہ کیوں
منہ بولے ہے یارو گویا مہندی اس کی رچائی ہوئی

لطف اس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو
کیا جانئے جان ہے کہ تن ہے

لکنت سے کیا نکلتی نہیں اس کے منہ سے بات
چپکا ہے حرف یار کے شیریں دہن کے ساتھ

منہ اپنا ان نے عکس سے اپنے چھپا لیا
دیکھا نہ کوئی آئینہ رو اس حیا کے ساتھ

اس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں
نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تک کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

اس گل زمیں سے اب تک اُگتے ہیں سرو جس جا
مستی میں جھکتے جس پر تیرا پڑا ہے سایا
جمالیاتی تجربہ جسمانی سطح سے پھوٹتا ہے اور تخلیل کی روشنی میں نبا کر پھر جسمانی سطح پر
آ جاتا ہے اور ”رس“ عطا کرتا ہے۔ اس کی خُسی کیفیت یا حیثیت (Sensuousness) متاثر
کرنے لگتی ہے۔ آرزو صرف یہ ہے کہ جسم کی سطح پر دو ایک ہو جائیں اور ایک جمالیاتی وحدت
قامم ہو جائے۔ اس تجربے کے تعلق سے اشعار پڑھتے جائیے، شاعر کے وجود ان اور تخلیل کی
حرانگیز کیفیتوں کا تاثر گہرا ہوتا جائے گا۔ میر صاحب حسن پسند ہیں، حسن کا احساس دیتے

رہتے ہیں، شرِنگار کے تجربوں میں ان کا تخلیل شاداب اور مشاہدہ گھرا ہے، متوازن لمحے میں کیف و سرور اور نغمگی توجہ طلب بن جاتی ہے۔ لفظوں میں حسن کا جس طرح اظہار ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار نے حسن کو کس شدت سے محسوس کیا ہو گا۔ میر صاحب نے اپنی حسن پسندی کا اظہار کھل کر کیا ہے، ان کی شاعری حسن کے خصی رُ عمل کی ایک بڑی خوبصورت شاعری ہے۔

”شرِنگار“ کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں، ایک احساسِ حسن کی شدت اور دوسرا رومانیت۔ میر صاحب کے کلام میں یہ دونوں خصوصیتیں موجود ہیں، وہ حسن کا گھر احساس رکھتے ہیں اور اکثر محسوس ہوتا ہے کہ اس احساس میں بڑی شدت پیدا ہو گئی ہے، اس طرح ان کی رومانیت اور رومانیت کی شیرینی اپنی مثال آپ ہے۔

”شرِنگار“ کی طرح غزل کی بھی یہ دو بڑی خصوصیتیں ہیں احساسِ حسن اور رومانیت! عاشق اور محبوب کے کردار میں ان خصوصیات کی پہچان زیادہ ہوتی ہے۔ اردو غزل کے عام روایتی عاشق اور محبوب کی ذات کی تشكیل میں میر کے شعری تجربوں نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ میر کے انفرادی جمالیاتی رویے کی وجہ سے دونوں کرداروں میں زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے، غالبت کے عاشق اور محبوب کی طرح کلامِ میر میں کوئی روشن جہت دار تصور نہیں ملتا۔ بلاشبہ کلامِ میر میں جذبہ بھی اہم ہے اور تخلیل بھی۔ لیکن عاشق اور محبوب کے تعلق سے وہ نہیں ہے جو غالبت کے کلام میں ہے۔ غالبت نے عاشق اور محبوب دونوں کو اعلیٰ اور افضل قدر (Supreme Value) بنادیا ہے کہ جس سے زبردست جمالیاتی آسودگی حاصل ہوتی ہے، جمالیاتی انبساط ملتا ہے۔

میر کے عاشق کا جمالیاتی شعور بالد ہے، یہی وجہ ہے کہ حسن کا احساس مجسم ہو جاتا ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشه گری کا

کیا صورت ہے، کیا قامت ہے، دست و پا کیا نازک ہیں
 ایسے پسلے منہ دیکھو جو کوئی کلال بنادے گا
 میر کا عاشق گوشت پوست کا پیکر ہے جو گوشت پوست کے پیکر سے والہانہ عشق کرتا ہے:
 کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
 اگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چپاں لباس کے
 کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
 کیا بدن کا رنگ ہے تہہ جس کی پیرا ہن پہ ہے

میر کا عاشق محبوب کے جسم میں زبردست کشش تو محسوس کرتا ہی ہے اس کے بدن کے رنگ کا
 دیوانہ تو ہے ہی ساتھ ہی محبوب کے بدن کی خوشبو سے بھی پریشان پھر رہا ہے۔ یہ کہتے
 ہوئے ”گوندھ کے گویا پتی“، گل کی وہ ترکیب بنائی ہے، ”رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی
 بھیگے پسینے میں“، یہ بھی کہتا ہے:

ستھرائی اور نازکی گلبرگ کی درست
 پرویی بو کھاں کہ جو ہے اس بدن کے نجع

گل کو محبوب ہم نے قیاس کیا
 فرق نکلا بہت جو باس کیا

اس گلِ تر کی قبا کے کہیں کھولے تھے بند
 رنگوں گل برگ کے ناخن ہے معطر اپنا

میر کا عاشق وصل کا تجربہ حاصل کر چکا ہے اس کے باوجود وصل کے لمحوں کو پانے کا خواہش مند رہتا ہے:

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ
میر کے عاشق کی حسن پسندی محبوب کے وجود کے حسن و جمال کو مجسم کر دیتی ہے:
چہرہ: کیا چہرہ تجھ سا ہوگا اے آفتاں طلعت
منہ چاند کا جو ہم نے دیکھا تو چھائیاں ہیں

ہونٹ،لب: میر کیا بات اس کے ہونٹوں کی
جینا دو بھر ہوا میخا پر

ناز کی اس کے لب کی کیا کہتے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

گل برگ کا یہ رنگ ہے مر جاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹ لعل ناب سا

نگاہ: گزرہ میں اس سلوک سے دیکھا نہ کر مجھے
برچھی سی لاغ جا ہے جگر میں تری نگاہ

بدن کارنگ: اس سے یوں گل نے رنگ پکڑا ہے
شمی سے جیسے لیں چراغ لگا

اندازِ دیدنی: ہلتی ہے یوں پلک کہ گڑی دل میں جائے ہے
انداز دیدنی ہے مرے دل نواز کا

مژہ: اس لطف سے نہ غنچہ نرگس کھلا کبھو
کھلنا تو دیکھ اس مژہ نیم باز کا

نقشِ پا: ہر نقشِ پا ہے شوخ ترا رشک یاسمن
کم گوشہ چمن سے ترا رہ گزر نہیں

لباس: جی پھٹ گیا ہے رشک سے چپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

خوبیو: سترائی اور نازکی گلبرگ کی درست
پر ویسی بو کہاں کہ جو ہے اس بدن کے پنج

کل لے گئے تھے یار ہمیں بھی چمن کے پنج
اس کی سی بو نہ آئی گل و یاسمن کے پنج

گل کی تو بو سے غش نہیں آتا کسو کے تیس
ہے فرق میر پھول کی اور اس کی بو کے پنج

روایتی مزاج کے ساتھ اس طریقہ پہچانا جاتا ہے: میر کا عاشق کبھی
گوشت پوست کا ایک دلنواز، دلکش اور انہتائی پرکش پیکر خلق ہو جاتا ہے!

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لا غری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا
اور کبھی عشق کا سچا درد لیے، اذیت ناک لمحوں سے گزرتے ہوئے اس طرح:

گھپیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

دل نہ پہنچا گوشہ دام تلک
 قطرہ خون تھا مرہ پر جم رہا

ہر صبح حادثہ سے یہ کہتا ہے آسمان
 دے جام خون میر کو گر منہ وہ دھو چکا

میر کا عاشقِ عشق کے جادو سے اتنا بے خود ہو جاتا ہے کہ ایک عجیب و غریب کیفیت طاری
 ہو جاتی ہے، خود اپنا انتظار کرنے لگتا ہے:

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا
 میر کا عاشق اُرد و غزل میں المیہ کے درد اور المیہ کی جمالیات کو محسوس بناتا ہے:
 یک بیاباں ہے مری بے کسی و تہائی
 مثل آواز جرس سب سے جدا ہو جاتا ہوں

دل کو جانا تھا گیا رہ گیا ہے افسانہ
 روز و شب ہم بھی کہانی سی کہا کرتے ہیں

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں
 اندر ہی سینے میں میرے دل کو کوئی کھاتا ہے

اے بوئے گل سمجھ کے لہکیو پون کے بیچ
 زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ
 میر کے عاشق کے طرز کا انداز بھی بہت تیکھا ہے:

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں بجان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

درویش ہیں ہم آخر دو اک نگہ کی رخصت
گوشے میں بیٹھے پیارے تم کو دعا کریں گے

میر کے عاشق اکثر خود کلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے:

کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا

زندگی میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

میر از بس کہ ناتواں ہوں میں
جی میرا سائیں سائیں کرتا ہے
میر کے عاشق کا انداز، لب والجہ اور تیور اکثر مکالمہ کی فضا خلق کر دیتے ہیں:

موسم ابر ہو ، سیبو بھی ہو
گل ہو ، گلشن ہو اور تو بھی ہو

کب تک آئینے کا یہ حسن قبول
منہ ترا اس طرف کبھو بھی ہو

تم تو تصویر ہوئے دیکھ کے کچھ آئینہ
اتنی چپ بھی نہیں ہے خوب کوئی بات کرو

ایسے آہوئے رم خورده کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشه گری کا

ایے وحشی کہاں ہیں اے خوباب
میر کو تم عبث اداس کیا

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزوں کا
وحشت کرنا شیوه ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

ترے کوچ میں یکسر عاشقوں کے خار مژگاں ہیں
جو تو گھر سے کھون لئے تو رکھیو پاؤں آہستہ

شمیخ اخیر شب ہوں سن سرگزشت میری
پھر صح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری ڈکاں شیشه گر ہے

میر کے عاشق کے حصی اور جمالیاتی تجربے "شرنگارس" میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ احس حسن، رومانیت، غمنا کی، عشقیہ تجربے یہ سب عاشق کے حصی اور جمالیاتی تجربوں میں شامل ہیں۔ میر مرت آمیز احساسات یا Pleasurable Sensations کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ ان کے شعری تجربوں میں موضوع اور مواد کو ڈرامائی صورت دینے کا بھی رجحان موجود ہے، تجربہ مختلف انداز سے ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا ہے، مثلاً:

اک زخم کو میں ریزہ الماس سے چیرا
دل پر ابھی جراحت نو کار بہت ہیں

جائے پوچھا جو میں یہ کارگہہ مینا میں
دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ

کہنے لائے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مت
ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ

دل ہی سارے تھے پہ اک وقت میں جو کر کے گداز
ٹکل شیشے کی بنائے ہیں کہاں ہے شیشہ

کل پانو ایک کاسہ سر پر جو آگیا
یک سروہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پرغور تھا

فرصت سے اس چمن کی کل روکے میں جو پوچھا
چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو بنس کر
اس قافلے میں کوئی دل آشنا نہیں ہے
مکڑے گلے کے اپنے نا حق نہ اے جرس کر

^۱ اُنک عمر مجھے خاک میں ملتے ہوئے گزری
کوچے میں ترے آن کے لوہو میں نہایا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرا
ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سرخار ہنوز

کر سیر جذبِ الفت گھپیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

راتِ مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویرِ لگادے کوئی دیوار کے ساتھ

درد و اندوہ میں ٹھہرا جو رہا میں ہی ہوں
رنگ رو جس کے کبھو منہ نہ چڑھا میں ہی ہوں
خار کو جن نے لڑی موتی کی کر دکھلا یا
اس بیابان میں وہ آبلہ پا میں ہی ہوں

کاسہ سر کو لیے مانگتا دیدار پھرے
میر وہ جان سے بیزار گدا میں ہی ہوں

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ ڈھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ
کل میر کھڑا تھا یاں چج ہے کہ دوانا تھا

وہ ڈزو دل نہیں تو کیوں دیکھتے ہی مجھ کو
پلکیں جھکالیاں ہیں آنکھیں چدالیاں ہیں

ذُنیا اور زندگی کے حسن کا یہ غیر معمولی احساس توجہ طلب ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا
دوسری جگہ اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے:

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دُکان شیشہ گر ہے

”آفاق کی کارگہہ شیشہ گری“، کہہ کر زندگی کے حسن و جمال کو جس طرح سمینے کی کوشش کی گئی ہے وہ بہت بڑی بات ہے۔ کارگہہ شیشہ گری میں جہاں نازک شیشے مختلف صورتوں میں خلق ہوتے ہیں وہاں ان میں مختلف رنگوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ نازک، صاف شفاف اور رنگ برلنگے شیشوں کی یہ دُنیا انتہائی خوب صورت اور حسین ہے، یہاں زور سے سانس لی جائے تو شیشے چنک جائیں گے۔ میر صاحب نے حسن آفاق اور حسن زندگی کو جس طرح ایک شعر میں فنکارانہ انداز میں سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ شعر اچانک حسن و جمال کے ایک ارفع ایج (Image) کو پیش کر دیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ زندگی کے اپنے Sense Impression کی گہرائی سے قاری کے احساساتی تاثر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہاں تخيّل، تصویر اور ”فینسی“ (Fancy) کی آمیزش سے ایک خوب صورت شعری جمالیاتی تجربہ سامنے آیا ہے۔ اس شعر کا حسن یہ بھی ہے کہ شاعر نے دُنیا اور زندگی کے عام تصورات کے اوپر انتہائی خوبصورت لباس کی چادر ڈال دی ہے، التباس کی چادر سے جوشعا عیں پھوٹ رہی ہیں وہ مسرت آمیز بصیرت عطا کر رہی ہیں۔ سچائی بھی ہے کہ یہ

☆ غالبت نے شیشے کی اس دُنیا کو اپنے وجود میں کھینچ لیا ہے۔ کہا ہے میں ایسا پہاڑ ہوں جس کے اندر آئینوں کی دُنیا ہے، سخت جاں ہوں اور خاطر نازک بھی رکھتا ہوں۔ شوق، انا نیت، خودداری اسی آئینہ صد نشاط کی دین ہیں:

سخت جانیم و قاش خاطر ما نازک است
کارگہہ شیشہ پنداری بود کہسار ما

دنیا، یہ زندگی بہت خوب صورت ہے، بہت نازک ہے، نفیس ہے، پر آہنگ ہے، حسین رنگوں کا مجموعہ ہے، کارگاہ شیشہ گری میں حسن کی تخلیق کا سلسلہ جاری ہے!

”شرِنگار رس، جس احساسِ حسن کا تقاضہ کرتا ہے وہ یہاں موجود ہے۔ یہ احساسِ حسن ہی ہے کہ حس کی وجہ سے گلشن میں رنگِ گل سے آگ لگنی نظر آ رہی ہے:

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

گوشت پوست کا محبوب ہو یا اللہ، وہ حسن ہے، حسن کا سرچشمہ ہے، اسی کا جلوہ ہے جو کائنات میں پھیلا ہوا ہے، خورشید و مہ ہو یا گل و آئینہ، ہر جگہ بس اسی کا حسن نظر آتا ہے۔ اسی کے روکی چمک دمک، اسی کے چہرے کی روشنی اور تازگی، اسی کی صورت کا رنگ ہر جگہ ہے:

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا مذھر تیرا ہی رو تھا

دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میر

پڑی جہان میں جا کر نظر جہاں میری

حسن کا شدید احساس لیے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

آئینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لباب

رازِ نہان حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

ہوا رنگ بدلتے ہے ہر آن میر

زمین و زماں ہر زماں اور ہے

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن محدود جانتے ہیں

صحح ہوئی گزار کے طائر دل کو اپنے ٹوپیں ہیں
یاد میں اس خود روگلِ تر کی کیسے کیسے بولیں ہیں

اک نور گرم جلوہ فلک پر ہے ہر سحر
کوئی تو ماہ پارہ ہے میر اس رواق میں

چھائی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشک باغ
جو شش بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو

کائنات خوب صورت ہے، دُنیا کی ہر شے حسین اور دلکش ہے، گل و آئینہ اور خورشید و
مہ کے استعارے حسن کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، جدھر نظر جاتی ہے بس حسن ہی نظر آتا
ہے، تصوف اور اس کی رومانیت نے حسن اور حسن کے سرچشمے کا جو پیارا ساد لفربیب تصویر دیا
ہے، میر صاحب نے اس سے گھری روشنی حاصل کی ہے۔

بنیادی سچائی یہ ہے کہ فطرت یا نیچر میں جو حسن ہے اسی نے انسان کے جمالیاتی شعور
کی تشكیل میں نمایاں حصہ لیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کے جمالیاتی شعور
نے فطرت یا نیچر کو حسن بخشا ہے۔ جمالیاتی احساس نہ ہو تو نیچر کب خوب صورت اور دلکش
لگے، جمالیاتی احساس و شعور ہی سے فطرت یا نیچر کا حسن اُبھرتا ہے۔ یہ بھی کہہ کر خلق ہوتا
ہے یا اس کی نئی تخلیق ہوتی ہے۔ خدا محبوب ہے، حسن ہے، مرکزِ حسن ہے، سرچشمہِ حسن ہے،
جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ سب اسی کا جلوہ ہے۔ گل، مہتاب، خورشید سب میں اس کا چہرہ
ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں انسان کا دل ہو یا اس کی صورت ہو، اس کا پورا وجود، اس کا ظاہرو
باطن حسن الہی کا آئینہ ہے، کہنے کو رازِ حق پوشیدہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ حسن ظاہر ہونا چاہتا تھا

لہذا انسان کا وجود (ظاہر اور باطن دونوں) آئینہ بن گیا!

کائنات کے حسن کو محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم

یا عالم آئینہ ہے اس یا ر خود نما کا

حسن کائنات حسنِ حقیقی کا عکس ہے، آئینہ ہے، خالقِ یار خود نما ہے، وہ چاہتا تھا کہ وہ جانا جائے، پہچانا جائے، محسوس کیا جائے، اس لیے یہ کائنات خلق کر دی۔ اس کا حسن ہے کہ بس ہر جانب ہر سو بکھرا ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل دو اشعار میر کے تصورِ حسن میں بڑی کشادگی پیدا کر دیتے ہیں:

ہوارنگ بد لے ہے ہر آن میر

زمین وزماں ہر زماں اور ہے

اور

دل کو جو خوب دیکھا تو ہو کا مکان ہے

ہے اس مکان میں ساری وہی لامکاں کی طرح

گوتم بدھ نے کہا تھا تم ایک ہی ندی میں دوسری بار قدم نہیں رکھ سکتے اس لیے کہ تم

بدلتے رہتے ہو!

ہر دوسرے لمحے انسان خود ہی تبدیل ہو جاتا ہے!

بدھ ازم میں یہ بات اس حد تک آگے بڑھی ہے کہ رُوح بھی یکساں نہیں رہتی، اس

میں بھی ہیئتگی نہیں ہے، یہ بھی مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

جیں ازم کے مطابق چراغ کی لو، ہر لمحہ تبدیل ہوتی ہے، یکساں نہیں رہتی، روشنی کا

تسلسل تو قائم رہتا ہے لیکن لو میں تبدیلی بھی مسلسل ہوتی رہتی ہے، ہر لمحے لو کی صورت بدل

جاتی ہے، پہلی صورت گم ہو جاتی ہے اور نئی صورت پیدا ہو جاتی ہے، شام کے روشن کے

چراغ کو صبح تک بجھاتے ہوئے لاکھوں لاکھ تبدیلیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔

گوتم بدھ کی بات اس بات سے مختلف ہے ناکہ ندی کیساں نہیں رہتی ہر لمحہ بدلتی رہتی
ہے، ایک ہی ندی میں دوسری بار قدم نہیں رکھتے اس لیے کہ ندی بدل جاتی ہے!
یہ تینوں باتیں متاثر کرتی ہیں، ایک بنیادی خوب صورت سچائی کا احساس دلاتی ہیں
اور اس احساس کو بالیدہ کرتی ہیں۔ ان تینوں باتوں میں زندگی اور کائنات کا حسن اور اس کا
مسلسل تخلیقی عمل پوشیدہ ہے۔ حسن ہر لمحہ تبدیل ہوتا رہتا ہے، طلوع آفتاب سے غروب
آفتاب تک کامنظر ہر لمحے کو حسن کا ایک نیا نقش بناتا رہتا ہے۔
ان باتوں کی روشنی میں میر صاحب کے پہلے شعر کو پڑھئے تو ان کے احساسِ جمال کی
وسعت اور گہرائی کا اندازہ ہو گا:

ہوا رنگ بدلتے ہے ہر آن میر
زمین و زماں ہر زماں اور ہے
ہر لمحے کے بدلتے ہوئے رنگ کا یہ انتہائی خوب صورت احساس ہے۔ ”ہوا رنگ
بدلتے ہے“ اور ”ندی کیساں نہیں رہتی، ہر لمحہ تبدیل ہوتی ہے“، ”تم کیساں نہیں رہتے ہر لمحہ
تبدیل ہوتے رہتے ہو“، ”روح میں ہر لمحہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے، چراغ کی لوہ ہر لمحہ تبدیل
ہوتی ہے“، ایک دلفریب صورت گم ہوتی ہے تو دوسری خوب صورت آ جاتی ہے۔ ان میں
کیا فرق ہے؟ ایک ہی بات مختلف انداز سے کہی گئی ہے۔ بڑی گہرائیوں میں اُتر کرو جود،
زندگی اور کائنات کے ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہے حسن کو محسوس کیا گیا ہے۔
کلامِ میر میں حسن ایک ثابت آفتابی انسانی قدر ہے، زندگی اور کائنات کے حسن و
جمال اور مسلسل نئی صورتوں کے ساتھ وجود میں آتے جلوؤں کا غیر معمولی احساس بخشنا گیا ہے۔
زندگی خوب صورت ہے، ہر لمحہ اس کا رنگ تبدیل ہوتا ہے، حسن کی تخلیق کا سلسہ جاری ہے۔
دوسرا شعر دیکھئے:

دل کو جو خوب دیکھا تو ہُو کا مکان ہے
ہے اس مکان میں ساری وہی لامکاں کی طرح

دل کو ہو، کامکاں کہا ہے۔ خالقِ کائنات کا مکاں بھی ہو، کامکاں ہے، خالی، جہاں کچھ بھی نہیں ہے، ایک عجیب و غریب پراسرار ستائی ہے، کچھ نہیں، ہی میں سب کچھ ہے! پراسرار ستائی اور خاموشی کے اندر حسنِ حقیقی کا آہنگ ہے، دل کے اندر، بہت اندر، بہت ہی اندر دیکھا تو لگایہ ہو، کامکاں ہے، وہی پراسرار ستائی ہے جو خدا کے ہو کے مکاں میں ہے۔ یہ پراسرار ستائی بھی غیر معمولی نوعیت کا ہے، ہو کے عالم کے اندر، اس 'کچھ نہیں' کے بھیتر بھی سب کچھ ہے، کون جانے یہ دل، ہو کا وہ مکاں ہو کہ جس میں خدا ہے! حسنِ حقیقی ہے!

دل کو حسن کا مرکز اور حسن کا سرچشمہ بنادیا ہے!

اس شعر کا حسن یہ بھی ہے کہ خدا کا مکاں کہ جہاں کچھ بھی نہیں ہے، دل سے علیحدہ محسوس نہیں ہوتا، ”ہے اس مکاں میں ساری وہی لا مکاں کی طرح۔“ جو کچھ خدا کے مکاں کے بارے میں سنتے ہیں وہ سب دل میں موجود ہے، خدا کا مکاں تو دیکھا نہیں لیکن دل جب خوب دیکھا تو ہو کا مکاں نظر آیا، شدت سے ہو کا مکاں محسوس ہوا، ہو سکتا ہے یہی وہ لا مکاں ہو، ہو کا عالم لیے ہوئے خدا کا مکاں جہاں کچھ بھی نہیں ہے! یہاں کچھ بھی نہیں ہے لیکن اس 'کچھ نہیں'، ہی میں سب کچھ ہے!

میر صاحب نے ان دونوں اشعار میں جس طرح جلال و جمال کو سمیٹ لیا وہ اپنی مثال آپ ہے، ستائی اور خاموشی اور ہو کے عالم میں حسن کو حد درجہ محسوس بنادیا ہے۔ نیز زندگی کے ہر لمحہ بدلتے رنگ اور آہنگ کے تینیں بیدار کیا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے فرش عرش سب قلبِ حزیں میں سمائے ہوئے ہیں، بظاہر جو تنگ گھر ہے اس میں فرش و عرش کی تمام فضائیں موجود ہیں، دل کے اندر، اس کی گہرائیوں میں طرح طرح کی دلکش اور دلفریب فضائیں دیکھی ہیں:

ہے فرش عرش تک بھی قلبِ حزیں کا اپنے
اس تنگ گھر میں ہم نے دیکھی ہیں کیا فضائیں
دوسری جگہ کہتے ہیں:

گھر دل کا بہت چھوٹا پر جائے تعجب ہے
عالم کو تمام اس میں کس طرح ہے گنجائی

”شرنگار رس“ میں حیرت و استعجاب کی بڑی اہمیت ہے، میر صاحب کے وہ اشعار جو احساسِ حسن اور اس کی شدت کو پیش کرتے ہیں، جو الیہ کے حسن کے تیس بیدار کرتے ہیں اور رومانیت اور اس کی ڈرامائی کیفیت کو نمایاں کرتے ہیں حیرت و استعجاب کو بھی محسوس بناتے ہیں، ر. جان اور لمحہ حیرانی کا احساس لیے ہوئے ہوتا ہے جس سے اشعار کی دلاؤیزی اور بڑھ جاتی ہے۔ بلاشبہ غالب تحریر اور تحریر کی جمالیات کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ”شیرنگار رس“ اور ”Great Wonder“ کے بڑے شاعر اور میر ”شرنگار رس“ کی شیرینی، منہاس، نفاست اور دلاؤیزی لیے تحریر کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت تحریبوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں تحریر لیے تحریبوں کے چھوٹے چھوٹے نقش ملتے ہیں۔ انھیں ”Small Wonder“ کا شاعر کہا جا سکتا ہے، لیکن اس میں بڑی گہراوی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

سب سطح ہے پانی کا آئینے کا ساختہ
دریا میں کہیں شاید عکس اس کے بدن کا تھا

منظرد کیھئے، محبوب کے بدن کے عکس کو دیکھ کر پانی حیرت سے جنم گیا ہے اور آئینہ بن گیا ہے، اس آئینے میں اس خوب صورت جسم کا عکس اس طرح جلوہ گر ہے کہ جیسے اس پر نقش ہو گیا ہو، ”دریا میں کہیں شاید“ سے شعر کا لطف بڑھ گیا ہے۔ محبوب کا بدن حسن کی انتہا ہے یعنی حیرت! غالبًاً گیئے نے کہا تھا حسن کی انتہا حیرت ہے۔ پانی نے شاید کہیں اس بدن کا عکس اپنے اوپر پایا تھا، دریا میں شاید کہیں محبوب کے حیرت انگیز جسم کا عکس پڑا ہو گا کہ دریا کا سارا پانی حیرت سے ٹھہر گیا اور صرف یہی نہیں آئینے کا ساختہ بن گیا ہے کہ جس پر محبوب کے بدن کا عکس نقش ہو کر رہ گیا ہے۔

غالب کا ایک شعر ہے:

نادر آب افتادہ نکس قد دل جویش
 چشمہ ہمچو آئینہ فارغ از روانی ہاست
 (غائب)

میر نے ایک واقعہ پیش کیا ہے، قیاس آرائی دلکش ہے، 'شاید' سے واقعہ کی حیرت انگیز کیفیت کو محسوس بنایا ہے، داستان کی سحر انگیزی جذب ہو گئی ہے کہ جس سے تحریر بڑھ گیا ہے "ایسا بوا ہو گا تب ہی ایسا ہوا ہے" یا "شاید ایسا ہوا ہو گا تب ہی ایسا ہوا ہے"۔ میر نے ایک ایسے منظر کو پیش کر دیا ہے کہ جس میں حیرانی کا احساس موجود ہے۔ شرنگار رس ایسا پٹکا ہے کہ صاف شفاف پانی آئینے کا تختہ بن گیا ہے کہ جس پر محبوب کے بدن کا نکس نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ دریا میں کہیں اس بدن کا نکس پڑا ہو گا کہ ندی کا سارا پانی آئینہ جسم بن گیا ہے!
 یہ ایک خوبصورت منظر ہے، ایک پیاری سی تصویر، ایک دلکش نقش!

غالب کا شعر ایک متھر کڈرامائی منظر ہے، محبوب اور بہتا ہوا چشمہ دونوں کردار میں جاتے ہیں، محبوب کا نکس بتتے ہوئے چشمے پر پڑتا ہے تو چشمے کا بہاؤ رُک جاتا ہے، اس کا نکس چشمے پر ہے اور چشمہ دم بخود ہو کر ٹھہر جاتا ہے۔ وہ حیرت اور مسرت سے اس حسن کو دیکھ رہا ہے۔ تصور کیجیے اس منظر کا کہ جس میں محبوب چشمے کی جانب جھکا ہوا ہے، اس کا نکس چشمے پر ہے اور چشمہ دم بخود ہو کر اس کے حسن کو تک رہا ہے!

غالب کے کلام میں تو ظلم کی ایک بڑی حیرت انگیز دنیا ہے، وہ اکثر حیرت یا تحریر کی حالت طاری کر دیتے ہیں، ان کا یہ شعر بھی تحریر کی جمالیات کی عمدہ مثال ہے لیکن چونکہ یہ شعر فارسی زبان میں ہے اور میر کا شعر اردو زبان میں، اس لیے میر کا شعری تجربہ اساس وجد بے سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے اور پھر یہ کہ غالبت سے بہت پہلے یہ شعر کہا گیا ہے۔ اس کے کیف و مسرور کی اور ہی کیفیت ہے، جمالیاتی انبساط اور طرح کا ہے۔ خیال کی زرخیزی اور ابجے کی ظلمی کیفیت کو اس طرح کسی نے پیش نہیں کیا کہ اس کیفیت کے ساتھ دریا کے پورے پانی پر ایک حیرت انگیز نقش ابھر آئے۔ شرنگار رس کے پیش نظر میر کا یہ شعر اردو کی

بوطیقا میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

”شرنگارس، کوئی تحریر کا یہ نقش بھی توجہ چاہتا ہے:

منہ تکا ہی کرے ہے جس تک کا

حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

آئینہ متحیر ہے، اس لیے کہ اس نے محبوب کا چمکتا دملتا روشن چہرہ دیکھ لیا ہے، گم سم ہو گیا ہے، اسی گم سم حالت میں جس تک، ہر ایک کامنہ تک رہا ہے، شاید ایک بار پھر محبوب نظر آجائے۔ ”منہ تکا ہی کرے ہے“ سے ”واقعہ اور کیفیت“ دونوں کو نقش کر دیا ہے، یہ واقعہ ہوا تھا، اس نے محبوب کے جلوے کو دیکھا تھا تب سے یہ کیفیت ہے، منہ تکا ہی کرے ہے! دوسرے مصروع میں آئینے کی حیرت کا احساس بڑھادیا گیا ہے۔ ”حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا؟“ یہ حیرت کا پیکر کیوں بن گیا ہے؟ ظاہر ہے اس نے کسی کارروائی تباہا کیا ہے، کس کا چہرہ تھا وہ؟ — کہ گم سم ہے اور جس تک کامنہ تک رہا ہے! حیرت زدہ آئینہ حسن کی تلاش میں ہے، وہ حسن جو اسے متحیر کر گیا ہے!

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ محبوب آئینہ دل کے سامنے آیا تو اس کا دملتا چہرہ اس پر نقش ہو گیا، وہ چلا گیا، آئینہ دل کو متحیر کر کے، پھر اب تک اس آئینے کے سامنے نہیں آیا ہے، تب سے آئینہ دل حیرتی ہے، جس تک کامنہ تک رہا ہے۔ اسے کس کی تلاش ہے؟

میر صاحب کا یہ شعر بھی توجہ طلب ہے:

آئینے کو بھی دیکھو پر نک ادھر بھی دیکھو

حیران چشم عاشق دکے ہے جیسے ہیرا

عاشق کی آنکھیں اتنی حیرت زدہ ہیں کہ ہیرے کی مانند دمک رہی ہیں، حسرتِ دیدار میں آنکھیں اتنی سفید ہو گئی ہیں کہ ان میں ہیرے کی مانند دمک اور روشنی آگئی ہے۔ آئینے کو ضرور دیکھو لیکن ادھر بھی تو نظر کرو، عاشق کی حیرت سے کھلی آنکھیں ہیرے کی طرح دمک رہی ہیں، اس میں آئینے کو بھی دیکھو جو متحرک اور روشن ہے۔ چشم سفید میں بھی ہیرے جیسا

نور ہے۔ ایک جگہ اپنے اس چشم حیراں کے حسن پر اس طرح فخر کیا ہے:
 جو دیکھوتے نہیں یہ حال اپنا حسن سے خالی
 دمک الماس کی سی ہے ہماری چشم حیراں میں
 محبوب کا حسن، حسنِ فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے، محبوب کا جلوہ ہو یا اس کا عمل، حسنِ
 فطرت اور مظاہرِ فطرت پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ میر کا ایک نہایت خوب صورت شعر ہے:
 اس گل زمیں سے اب تک اُگتے ہیں سرو مائل
 مستی میں جھکتے جس پر تیرا پڑا ہے سایہ
 غالب کی جمالیات میں اس رجحان اور جہت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مثلاً:
 دیکھے اس کے ساعد سیمیں و دست پر نگار
 شاخ گل جلتی تھی مثل شمع گل پروانہ تھا
 (غالب)

دیکھ کر تجھ کو چمن بسلکہ نمو کرتا ہے
 خود بخود پہنچے ہے گل گوشہ دستار کے پاس
 (غالب)

محبوب خود اپنے حسن و جمال کے نشے میں ہوتا ہے، جب چلتا ہے تو اس نشے کی وجہ
 سے جھومتا ہوا چلتا ہے۔ نشے میں جھکا ہوتا ہے اس لیے اس گل زمیں پر جہاں بھی اس کا
 سایہ پڑا وہاں سرو کے درخت اُگ آئے اور چونکہ نشے میں محبوب جھکا جھکا تھا اس لیے سرو کے
 درخت بھی سیدھے نہ اُگے، اُگے لیکن جھکے جھکے رہے۔ میر صاحب نے گل زمیں کہا ہے جس
 سے مراد وہ چمن ہے کہ جہاں گلوں کے رنگ اور ان کی خوبی پہلی ہوئی ہے، یہ بھی محبوب کے
 وجود کی وجہ سے ہے، محبوب کے وجود کے رنگ اور خوبی سے چمن گل زمیں بنتا ہوا ہے۔ اس
 شعر کا حسن یہ ہے کہ جھکے جھکے سرو کے اُگنے کا سلسلہ جاری ہے، اپنے حسن کی مستی پر کیا سایہ
 پڑا کہ اس گل زمیں سے اب تک جھکے ہوئے سرو اُگ رہے ہیں۔ شرینگار رس کی دونوں بڑی

خصوصیات یعنی احسِ حسن اور رومانسیت ایسے اشعار میں موجود ہیں، ایک جگہ کہتے ہیں:

پچھے گل سے ہیں شلغفتہ پچھے سرو سے ہیں قدکش

اس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

چونکہ محبوب گل سے زیادہ شلغفتہ اور سرو سے زیادہ قدکش ہے اس لیے اس کے تصور میں جو خواب دیکھتے ہیں ان میں ایسی صورتیں ہوتی ہیں جو گل سے زیادہ شلغفتہ اور سرو سے زیادہ قدکش ہوتی ہیں۔ محبوب کا حسن گل کے جلوے سے زیادہ ہے جو شلغفتگی اور جوشبو محبوب میں ہے گل میں نہیں ہے، اسی طرح محبوب سرو سے کہیں زیادہ قدکش ہے۔ خوابوں میں جو خوب صورتیں آتی ہیں وہ بھی گل سے زیادہ شلغفتگی لیے ہوتی ہیں، گل سے زیادہ کشش اور خوشبو ہوتی ہے ان میں اور وہ سب سرو سے زیادہ قدکش ہیں، ایسے خوابوں کا سبب یہی ہے کہ میں محبوب کے تصور میں گم ہو جاتا ہوں، اس کے تصور میں گم رہنے کی وجہ سے ایسے خواب نظر آتے ہیں:

گل کو محبوب ہم نے قیاس کیا

فرق نکلا بہت جو باس کیا

گل اور محبوب ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، گل دیکھا تو لگا محبوب سامنے ہے، گل کی شلغفتگی میں محبوب کی شلغفتگی لگی لیکن جب قریب گئے تو فرق کو محسوس کیا وہ اس طرح کہ دونوں کی خوشبو میں فرق تھا۔ محبوب کا وجود اپنی متفرد خوشبو رکھتا ہے، بھلا گل کے پاس یہ خوشبو کہاں، میر کی جمالیات میں محبوب کے وجود کی خوشبو نے جواہمیت اختیار کر لی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

صحن میں میرے اے گل مہتاب

کیوں شلغوفہ تو کھلنے کا لایا

پیارا سادل فریب شعر ہے۔ صحن میں گل چاندنی کی جھاڑی سے چاند کی کرنیں زمین پر پڑ رہی ہیں اور عاشق کی یادیں تازہ ہو گئی ہیں۔ چاندنی محبوب کے حسن اور اس کے وجود کا

عکس ہے کہ جس سے پرانے زخم ہرے ہو رہے ہیں، درد بڑھ رہا ہے، ایسا نہ ہو دیوانگی پھر طاری ہو جائے، حسن محبوب کی یاد کے ساتھ درد اور ٹیسوں کی یاد کا ایک سلسلہ قائم ہونے لگتا ہے۔ کہنے کو تو یہ کہا جا رہا ہے کہ ”میرے صحن میں اے گل مہتاب کیوں شگوفہ تو کھلنے کا لایا“، لیکن یہ کہتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے باطنی سطح پر انبساط بھی حاصل ہو رہا ہے، یادیں تازہ ہو رہی ہیں اور درد میں پھر کم پیدا ہو رہی ہے، دل میں ٹیس اٹھ رہی ہے۔ معروف ہندوستانی عالم جمالیات بھٹ لولتا (Batta Lollata) نے رسول پر گفتگو کرتے ہوئے باطنی سطح پر ایسے داخلی روحانی انبساط (Subjective Pleasure) کی جانب اشارہ کیا ہے۔ گل مہتاب سے تخاطب کا انداز ایسا نہیں ہے کہ جس سے یہ محسوس ہو کہ گل مہتاب نے غلطی کی ہے یا اس کی جھاڑی سے چاند کی کرنیں چھن کر جو آرہی ہیں انھیں آنانہ چاہیے تھا۔ ”شگوفہ“ کا لفظ غور طلب ہے ”کیوں شگوفہ تو کھلنے کا لایا“، کسی قسم کی ناراضگی نہیں ہے، گل مہتاب کا شگوفہ کیا کھلا یادوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ درد بڑھا، پرانے زخم کھل گئے، ٹیسیں بڑھیں، گل چاندنی سے چھن کر جو چاندنی نیچے اتری وہ محبوب کا حسن، اس کا جلوہ بن گئی۔ باطنی سطح پر جو لذت ملی وہ اسی شگوفہ کے کھلنے کی وجہ سے ملی۔ تخاطب کا انداز کچھ ایسا بھی لگتا ہے ”اے گل مہتاب تو نے ایسا کیوں کیا، دیکھ یادوں کا جو سلسلہ قائم ہو گیا ہے اس سے درد کتنا بڑھ گیا ہے! میرا جنوں ایک بار پھر بڑھ جائے گا۔“

پچھلے صفحات میں کہیں اس شعر کا ذکر کیا گیا ہے:

ہوا رنگ بدلتے ہے ہر آن میر

زمین و زماں ہر زماں اور ہے

اس کے ساتھ یہ شعر سنئے:

سرسری تم جہان سے گزرے

درنہ ہر جا جہان دیگر تھا

انہائی معصومانہ انداز میں عالم کے حسن کا احساس عطا کر دیا ہے۔ جلوہ عالم کی جانب

کتنی خوب صورت جھتیں ہیں اور اس کے جانے کتنے لفڑیب اور دلکش پہلو ہیں۔ ہم آتے ہیں کچھ دیر سیر کرتے ہیں، کچھ دیر حسن عالم کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں، یعنی سرسری طور پر دنیا کو دیکھتے ہیں، سرسری جہاں سے گزرتے ہیں۔ گل عالم کے تمام جلوؤں کو نہیں دیکھتے، یہاں تو ہر قدم پر ایک جہاں دیگر ہے، نت نئی دنیاؤں سے آباد ہے یہ عالم، ہر جا جہاں دیگر ہے کہ گریمیر صاحب نے عالم کی مختلف دنیاؤں، ان کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں کے حسن اور جلوؤں کے تینیں بیدار کر دیا ہے، روشنیوں اور خوبصورتوں سے بھری صرف ایک دنیا نہیں ہے، جانے کتنے اور کیسے کیسے رنگوں، خوبصورتوں اور روشنیوں کو لیے کئی جہاں ہیں، ہر جگہ، ہر قدم پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوتا رہا ہے۔ یہاں میر صاحب کا احساسِ حسن کتنا گہرا اور معنی خیز ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ان کے رومانی ذہن کی طاقت ہے کہ جس سے جذباتی سطح پر یہ جمالیاتی تجربہ حاصل ہوا ہے، بلاشبہ ایسے شعری تجربوں سے مسرت آمیز بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

میر کے کلام میں احساسِ حسن کبھی کبھی جلال کے پہلو کو شدت سے اُجاگر کرتا ہے۔ دلِ محض ایک قطرہِ خون ہے، طوفان کی صورت اختیار کر لیتا ہے، کچھ اس طرح کہ ماہیتِ دو عالم غوطے کھاتی پھرتی ہے، کہتے ہیں:

ماہیتِ دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہِ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا

دلِ عشق کا مرکز اور سرچشمہ ہے۔ محض یک قطرہِ خون ہے لیکن سرچشمہ تو انائی ہے۔ طوفان بن جاتا ہے اور ماہیتِ دو عالم چکرا جاتی ہے۔ دونوں عالم کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا، اس کے برعکس یہ دلِ محض ایک قطرہِ خون ہے، بظاہر اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن اس کی تو انائی غیر معمولی ہے، ایسا طوفان ہے کہ ماہیتِ دو عالم اسے سمجھنہیں پاتی، صرف یہی نہیں اسے جاننے پہچاننے کے لیے چکراتی پھرتی ہے، غوطے لگاتی رہتی ہے، اس کی ماہیت اور سچائی کو جاننے کے لیے! دل کا ذکر کر کے میر نے عشق اور اس کی تو انائی کا

احساس بالیہ کیا ہے۔

اس شعر کے ساتھ ان اشعار کو بھی پڑھئے تو اس رجحان کو پہچانے میں مدد ملے گی:

مت سہل ہمیں سمجھو پہنچنے تھے بہم تب ہم
برسون تیس گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

دل یہی ہے جس کو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ
کاش یہ آفت نہ ہوتی قابلِ آدم کے بیچ

برسون لگی رہی ہیں جب مہرومدہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

انسان کے وجود اور اس کے باطن کی توانائی کا احساسِ میر کے احساسِ حسن کا ایک اہم
پہلو ہے، چونکہ انسان کا دلِ حسن و عشق کا مرکز ہے، اس لیے انسان سب سے زیادہ قیمتی ہے۔
یہ اشعار بھی توجہ طلب ہیں:

میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جوش عملہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی رازِ نہاں ہوں

ہمت اپنی ہی تھی یہ میر کہ جوں مرغِ خیال
اک پر افشاری میں گزرے سر عالم سے بھی

ہم ہیں قلندر آ کر اگر دل سے دم بھریں
عالم کا آئینہ ہے یہ ایک ہو کے نج

پیدا ہے کہ پہاڑ تھی آتشِ نفسی میری
میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا

میں نے کہا ہے ”شہرِ نگار رس“، محبت اور غم کے جذبوں سے پیدا ہوتا ہے اور فن میں ان جذبوں کا جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ غم اور المیہ، عشقِ زندگی اور عشقِ محبوب کی دین ہے۔ میر صاحب کی سائیکلی میں زندگی اور محبوب دونوں کے عشق اور درد کی کیفیت ایسی ہے کہ انھیں کبھی کبھی علیحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عشقِ زندگی سے عبارت ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ فنکار کی سائیکلی، کو جو روحاںی جمالیاتی انبساط اور درد کی روحاںی اور جمالیاتی لذت حاصل ہوئی ہے انھیں اس نے بڑی سادگی سے قاری کی سائیکلی، کو عطا کر دیا ہے۔ اکثر خیالات اور احساسات قاری کی سائیکلی پر شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں، اکثر سحر انگیزی غیر معمولی نوعیت کی ہوتی ہے۔ غم اور المیات کا حسن قاری کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ ”غم“، میر صاحب کی شاعری اور اس شاعری کی جمالیات کا بنیادی جوہر ہے۔ ”لہو ان کا سب سے معنی خیز محبوب استعارہ ہے:

دل نہ پہنچا گوشہ داماں تلک
 قطرہ خون تھا مژہ پر جم رہا

چشم خون بستے سے کل رات لہو پھر ڈپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دل غفران پناہ کا

ہر صبح حادثہ سے یہ کہتا ہے آسمان
دے جامِ خون میر کو گر منہ وہ دھو چکا

دامن میں آج دیکھا پھر لخت میں لے آیا
ملکڑا کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا

اک عمر مجھے خاک میں ملتے ہوئے گزری
کوچے میں ترے آن کے لوہو میں نہایا

جگر ہی میں یک قطرہ خون ہے سر شک
پلک تک خون گیا تو تلاطم کیا

بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہہ نکلا
رہا جو سینہ سوزاں میں داغ دار رہا

لختِ دل کب تک الہی، چشم سے ڈپکا کریں
خاک میں تا چند ایسے لعل پارے دیکھئے

جم گیا خون کفِ قاتل پہ ترا میر زبس
آن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

ہر اشک میرا ہے درِ شہوار سے بہتر
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

لیتا ہی نکتا ہے مرا لختِ جگر اشک
آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے

وے دن گئے کہ آنسو رو تے تھے میراب تو
آنکھوں میں لختِ دل ہے یا پارہ جگر ہے

نہ تہا داغ تو سینے پہ میرے اک چمن نکلے
ہر اک لختِ جگر کے ساتھ سوزخم کہن نکلے

گھپیں سمجھ کے چنیوں کہ گلشن میں میر کے
لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی
اگر قاتل تو اپنے پاؤں سوپانی سے دھوئے گا

لوہو میں شور بور ہے دامان و جیب میر
بچرا ہے آج دیدہ خون بار بے طرح

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو آتا ہے جب نہیں آتا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

میرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

پلکوں پر تھے پارہ جگر رات
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات

کیا دن تھے کہ خون تھا جگر میں
رو اٹھتے تھے بیٹھ دوپھر رات

اے بوئے گل سمجھ کے مہکیو پون کے نیچے¹
زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے نیچے

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

گوخار کی اڑتی ہے مرے منہ پہ جنوں میں
ٹپکے ہے لہو دیدہ نمناک سے اب تک

نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا
شور اک آسمان سے اٹھتا ہے

جب نام تیرا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

سینہ ہے چاک جگر پارہ ہے دل سب خون ہے
تس پہ یہ جان بلب آمدہ بھی محزوں ہے

خورشید میں محشر کی تپش ہو گی کہاں تک
یہ ساتھ میرے داغوں کے محشور ہوا ہے

کیا جانے لذتِ درد اس کی جراحتوں کی
یہ جانوں ہوں کہ سینہ سب چاک ہو گیا ہے

ایدھر سے ابر اٹھ کر جو گیا ہے
ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے

مصابیب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرا
ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سرخار ہنوز

طرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنوں میں روز و شب
روتے روئے ہنئے لگا یہ میر عجب دیوانہ تھا

میر از بکہ ناتواں ہوں میں
جی میرا سائیں سائیں کرتا ہے

موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

یہ صرف میر کے خوب صورت جمالیاتی تجربے نہیں ہیں بلکہ اردو شاعری کے اہم نمائندہ جمالیاتی تجربے بھی ہیں۔ ان سے میر کی شاعری کے مزاج، ر. جان، رویے اور میلان کی پہچان ہوتی ہے۔ ان اشعار میں اُتر جائیئے تو ”شہزادگار رس“ لیے اردو کے اس ممتاز شاعر کے کلام کی روح تک رسائی ہو جائے۔ بلاشبہ یہ تجربے میر کی شناخت بن گئے ہیں۔ فنکار کے مزاج و شعور اور اس کی پوری شخصیت کا آہنگ دراصل ان ہی اشعار سے ملتا ہے۔ میر کے کلام کے بنیادی جمالیاتی ر. جان نے انہیں خلق کیا ہے۔

میر کے دوادین کے مطالعے سے خاکسار اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ میر کے کلام کی روح تک رسائی ایسے اشعار ہی سے ہو گی کہ جن میں غم اور ہم کے تجربے ہیں۔ ان تجربوں کا بڑا گہرا رشتہ محبوب کے پیکر سے ہے، ان تجربوں کے ذریعے بھی محبوب کے حسن و جمال اور اس کے تیور تک پہنچا جاسکتا ہے اور محبوب کے ذریعے بھی ان تجربوں تک آیا جاسکتا ہے۔ [اردو کی ادبی تنقید میں ابھی ر. جانات اور رویوں کا بہتر مطالعہ نہیں ہوا ہے۔ جب ر. جانات کا عمدہ مطالعہ ہو گا تو جمالیاتی ر. جانات کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکے گا۔ چند کمزور اور معمولی اشعار کی بنیاد پر کوئی مفروضہ قائم کر لینا آسان ہو سکتا ہے لیکن بنیادی جمالیاتی ر. جان قرار دیتے ہوئے کسی روئے یا ر. جان کو تجربوں کا سرچشمہ قرار دینا یا اسے بنیادی مرکزی ر. جانات

پروفیت دینا خواہ مخواہ کی ضد اور بہت دھرمی ہے۔ میر کے شور انگلیز تجربے (حالانکہ شور انگلیزی کے تعلق سے میر کے اکثر اشعار کمزور ہیں) اسی درد سے رشتہ رکھتے ہیں کہ جس سے ابوکا 'امیح، پھونا ہے۔]

درد غم اور المیات کے تعلق سے جوا شعار پیش کیے گئے ہیں وہ یقیناً میر صاحب کے نمائندہ اشعار ہیں، اردو شاعری میں ان اشعار سے قیمتی اضافہ ہوا ہے۔ یہ کلام میر کی روح سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان اشعار سے الیہ کی جمالیات اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ اس سچائی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ غالب اور صرف غالب نے المیات کی جمالیات کو شدت سے محسوس کرایا ہے۔ بہت سی روایتوں کے ساتھ میر کی روایت سے بھی انہوں نے یقیناً فائدہ اٹھایا ہے لیکن اپنی انفرادیت کو حد درجہ محسوس کر دیا ہے، الیہ کی جمالیات میں غالب ایک مستقل موضوع اور عنوان ہیں۔ اردو کی بوطیتا میں الیہ کی جمالیات کا اتنا بڑا شاعر اب تک نہیں ملا ہے۔ آئیے پہلے میر صاحب کے الیہ تجربوں اور ان تجربوں کے پہلوؤں اور ان کے حسن میں باتیں کریں۔ جوا شعار پیش کیے گئے ہیں، ان کے پیش نظر چند باتیں اس طرح سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

بعض اشعار میں ایسی دلاؤیزی ہے کہ فوراً قاری کی سائکلی کو متاثر کرنے لگتی ہے جس طرح Mozart کی موسیقی فوراً احساس اور جذبے سے قریب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میر کے ایسے تجربے دل و دماغ میں سامنے لگتے ہیں۔ Mozart کی موسیقی کی طرح بعض اشعار کا آہنگ سانس کی رفتار کے آہنگ میں جذب ہو جاتا ہے:

گچیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
لخت جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دھواں سا کھاں سے اُٹھتا ہے

جب نام تیرا لیجے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرا
ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سرخار ہنوز

ایسے اشعار کا جمال آفاقتی انسانی قدر کی طرح جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ غم و درد کے شعری تجربوں کے گرد جو چمک اور روشنی ہے وہ ستاروں اور سیاروں کے گرد بلوری (Crystal) شعاعوں کی مانند ہے۔ درد و غم کا تجربہ متحرک ہوتا ہے اور بلوری شعاعیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ تجربے کا حسن جلوہ بننے لگتا ہے۔ ہرالیسہ تجربہ اپنی حرارت اور تابانی سے متاثر کرتا ہے۔ میر کے الیسہ تجربے الیہ تصادم (Tragic Conflict) کو محسوس بناتے ہوئے فرد کی تکلیف اور اذیب کو نمایاں کرتے ہیں، شکست کا احساس بھی ملتا ہے۔ ہبورو نے کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ میر نے زندگی کو عشق میں تبدیل کر دیا ہے۔ لہذا غم زمانہ غم عشق بن گیا ہے اور غم عشق، غم زمانہ اور غم زندگی۔ افرادگی کی فضائتو موجود رہتی ہے لیکن ساتھ ہی لذتِ غم بھی ہے اور رُوح کا سوز و گداز بھی۔ الیسہ کے تجربوں میں کیفیتِ انبساط پیدا کر کے جمالیاتی تکیین کا سامان غالباً اردو شاعری میں سب سے پہلے میر صاحب ہی نے فراہم کیا ہے:

دامن میں آج دیکھا پھر لخت میں لے آیا
نکروں کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا

اک عمر مجھے خاک میں ملتے ہوئے گزری
کوچے میں ترے آ' کے لوہو میں نہایا

وہ دن گئے کہ آنسو روتے تھے میراب تو
آنکھوں میں لخت دل ہے یا پارہ جگر ہے

میرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

طرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنوں میں روز و شب
روتے رو تے ہننے لگا یہ میر عجب دیوانہ تھا

ایسے اشعار میں تصادم اور شکمش کی شدت پس منظر میں موجود ہے، الیہ تحریکے تصادم
ہی کی دین ہیں جو تمبا کے آہنگ سے آشنا کرتے ہوئے مسرت اور بصیرت بھی عطا کرتے
ہیں۔ ”شرنگار رس“ کے اس پہلو پر غور کرتے ہوئے میر کا محبوب استعارہ ”لہو“ بار بار مرکز نگاہ بنتا
ہے۔ ”لہو“ کلام میر کا مرکزی استعارہ ہے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا یہ استعارہ ان کی شاعری کی
جمالیات کا سب سے اہم سرچشمہ ہے۔ ”لہو“ کے تعلق سے اشعار پیش کیے جا چکے ہیں۔ چند
اور اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جام خوں بن نہیں ملتا ہے ہمیں صبح کو آب
جب سے اس چرخ سیہ کاسہ کے مہمان ہوئے

جم گیا خوں کف قاتل پہ ترا میر زبس
ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

نشاں اشک خونیں کے اڑتے چلے ہیں
خرزاں ہو چلی ہے بہارِ گریباں

سینے کے اپنے زخم سے خاطر ہو جمع کیا
دل ہی کی اور پاتے ہیں سب لوہو کا بہاؤ

جگرلوہ کوتر سے ہے میں سچ کہتا ہوں دل ختہ
دلیل اس کی نمایاں ہے مری آنکھیں ہیں خون بستہ

نہیں ابرو ہی مائل جھک رہی ہے تنے بھی ایدھر
ہمارے کشت و خون میں متفق باہم ہیں یہ دونوں

جائے روغن دیا کرے ہے عشق
خون بلبل چراغ میں گل کے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پر خون کی اک گلابی سے

پیش از دم سحر مرا رونا لہو کا دیکھ
چھولے ہے جیسے سانجھو ہی یاں سماں ہے اب

کس تازہ مقتل پر کشندے تیرا ہوا ہے گزر آج
زہ دامن کی بھری ہے لہو سے کس کو تو نے مارا آج

مرے منہ پر رکھا ہے رنگ اب تلک
ہزار آفریں چشم خون بار کو

بلاشبہ میر زندگی کی جانب اپنے تخلیقی رویے سے حسن پیدا کرتے ہیں، الیہ جذبات جہاں درد و غم کو لیے ہوئے ہیں وہاں نشاطِ غم بھی موجود ہے۔ میر کے الیہ میں Thrill نہیں

ہے لیکن الیہ تصادم، اس کے گھرے تاثرات نیز اس کے ایسے نتائج کہ جن سے درد غم کے احساس کے ساتھ جمالیاتی انبساط بھی حاصل ہو موجود ہیں اور یہی میر کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ میر کو پڑھتے ہوئے مجھے اچانک یونان کا ایک پرانا "لیجنڈ" یاد آگیا، حاکم وقت بڑا طالم تھا، اس کے عہد میں ایک فنکار مجسمہ ساز تھا کہ جس نے کانسی (Bronze) کا ایک بہت بڑا مجسمہ بنایا، نیل (Ox) کا یہ مجسمہ دیوبیکل تھا، مجسمہ ساز Berillers نے حاکم وقت سے کہا۔ یہ ایسا مجسمہ ہے کہ اگر اس میں ملزم یا گنہ گار کو ڈال دیا جائے اور اس کے نیچے آگ لگادی جائے تو ملزم یا گنہ گار کی ہر دردناک چیخ بیل کے منہ سے نغمہ بن کر نکلے گی اور بادشاہ اس نغمے سے محظوظ ہوں گے۔ یہ "لیجنڈ" صرف اس لیے یاد آیا کہ اچھے الیہ تجربے واقعی نغمے بن جاتے ہیں۔ میر کی شاعری میں بھی ایسا ہوا ہے اور غالب کی شاعری میں بھی۔ یہ شرینگارس ہی کا جلوہ ہے۔ المیات کے تجربوں میں میر "جدبے کے جمالیاتی تجربوں" کے ایک بہت اہم ممتاز شاعر کی طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔

میر کی شاعری میں غم ایک گہرا جذبہ ہے کہ جس کا ایک خوب صورت جمالیاتی استعارہ ہو ہے۔ غالب کی شاعری میں غم ہمہ گیر ہے اور یہاں ایک "آرج ٹاپ" (Archetype)! غالب کی شاعری میں یہ کے آرج ٹاپ کے اُبھرتے ہی تجربوں کا رنگ مختلف ہو جاتا ہے۔ شاعرانہ بصیرت کے ساتھ المیات کے حسن کا اساس شدید ہو جاتا ہے۔ لب و لبجھ میں نئی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ رنگ کی تصویر یہ زیادہ متحرک نظر آنے لگتی ہیں۔ "آرج ٹاپ" کی روشنی اور جمالیاتی وِژن کی صورت گرتوں سے 'الفاظ و معنی' کے رسمی تعلق سے زیادہ 'معنی و صورت' کے رشتے کی اہمیت کا احساس بڑھ جاتا ہے:

میں نے جنوں میں کی جو اسد التماں رنگ
خونِ جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے
(غالب)

"لہو" کے پیکر سے بہار کی یہ حسی تصویر کتنی اچھوتی ہے کہ میں اس قدر رویا کہ میرے لہو

سے بیباں لالہ زار بن گیا، میری 'خزاں' دامنِ صحرائی بہار ہو گئی، اہو کے رنگ سے بیباں اور صحرائی بہار کی یہ حسی تصویر مجرداً آرٹ کی کئی خصوصیتوں کو سمجھاتی ہے:

گرستیم آنقدر کز خون بیباں لالہ زاری شد

خزاں ما بہار دامنِ صحراست پنداری

(غالب)

جمالیاتی 'وژن' نے سرخ رنگ کے 'میج'، کواس طرح ابھار دیا ہے کہ رنگوں کی چنگاریاں اڑتی نظر آ رہی ہیں۔ رنگوں کی اس فضا کی تصویر، مجرداً آرٹ میں آسانی سے بنیادی تاثر کے ساتھ نہیں بن سکتی، رنگوں کے دھوئیں اور رنگوں کی چنگاریوں میں اسے ہر پھول آگ سے بھرے ہوئے دامن کو جھکتا نظر آ رہا ہے:

ہر گل از خویشت آتش داماں زده

ایک جمالیاتی 'میج'، جانے کتنے تاثرات ابھارتا ہے۔ اپنی آگ میں جلنے کا تاثر، اپنے حسن کے شدید احساس کا تاثر، حسن کی وحدت کا تاثر، رنگوں کی چنگاریوں اور سرخ دھوئیں کا تاثر، فضا کا احساس غیر معمولی احساس ہے۔

'اہو' کے رنگ سے 'شفق' کا یہ تصور کتنا ولفریب ہے کہ ہر بن مو سے خون بار چشمے جاری ہیں۔ آج کی شب اپنے بستر کو شفق سے سجا رہا ہوں، 'دامنِ صحراء' کی بہار اور 'آفتاب' کے رنگ کے ساتھ شفق کے رنگ کو بھی اہو کے 'میج' نے اس طرح ابھارا ہے:

از ہر بن ٹو چشمہ خون بار کشادم

آرائشِ بستر ز شفق میکنم امشب!

(غالب)

غالب کی شاعری میں بھی 'اہو' کا 'میج'، رنگوں کے عشق سے ابھرا ہے اور پھیلے ہوئے تہہ دار اور انہتائی پر اسرار جمالیاتی اجتماعی لاشعور میں اہو کے آرچ ناٹپ کو بیدار کرتے ہوئے پوری تہذیب کی ٹربجیدی کا علامیہ بن گیا ہے۔ ان کی شاعری میں ایسا جمالیاتی استعارہ

ہے، جس سے غم کی جگر کاری کے ساتھ نشاطِ ازیست کا بھی احساس ہوتا ہے، ”لہو دیوانِ غالب کا ایک بنیادی حصہ استعارہ اور پیکر ہے جس کے المیات اور اس کی جمالیاتی قدر و کام مطالعہ بھی ہو سکتا ہے اور شاعر کی آواز کے طسم اور اس کے آہنگ کی معنویت کا بھی ”لہو غالبیات میں آتش کی سیال صورت بھی ہے اور غم کا عرفان بھی، غالب نے اس پیکر کو انتہائی وجہ آفریں اور بصیرت افروز بنادیا ہے۔ یہ پیکر اپنی گہرائی، تہہ داری، تازگی، اطافت، حرکت، گرمی اور روشنی اور رنگ سے متاثر کرتا ہے۔ بلاشبہ غالب کی جمالیات میں اس پیکر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اشعار یاد کیجیے:

پھر بھر رہا ہوں خامہ مژگاں بے خونِ دل
سازِ چمن طرازی داماں کے ہوئے

خون ہو کے جگر آنکھ سے ڈپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے

دل خون شدہ کش کمش حسرت دیدار
آنکنہ بدست بت بدست حنا ہے

پھول اس چمن کے دیکھتے کیا کیا جھڑے ہیں ہائے
سیلِ بہار آنکھوں سے میری رواں ہے اب

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی ہے تو اک بوند لہو کی

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ڈپکا تو پھر لہو کیا ہے

چپک رہا ہے مدن پر لہو سے پیرا ہن
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

ایسا آس نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں

جو تھا سو مون رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالہ لبِ خونیں نوائے گل

سطوت سے تیرے جلوہِ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگ ادائے گل

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

باغ میں مجھ کونہ لے جاورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہنڈر میں جلوہ گل آگے گرد تھا

بیاں کیا تجھے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرہ خون دانہ ہے تبیحِ مرجان کا

غنجپہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

یہ اشعار بلاشبہ اردو کی بوطیقا کی آبرو ہیں۔ دنیا کی بہترین شاعری میں ان کا شمار ہوتا چاہیے۔ میر کی روایت بھی غالب تک آئی ہے اور غالب نے میر کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس روایت کی روشنی بھی حاصل کی ہے لیکن المیات اور اہو کے ایجح، کے پیشِ نظر غالب ایک مستقل عنوان بن گئے ہیں۔ غالب ایک دیوپکر شخصیت کا نام ہے۔ ”دیوانِ غالب“ اردو ادب کا سب سے بڑا معجزہ ہے، تخلیقی فن میں غالب کے ذہن کے ساتھ ان کے تہہ دار جمالیاتی وِژن نے تہہ داری اور معنی خیزی پیدا کی ہے۔ رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کا احساس عطا کیا ہے، اسی ”وِژن“ کی وجہ سے وہ ایک بڑے ”لیجند“ (Legend) بن گئے ہیں، میر خوب صورت اکھرے تجربوں کے شاعر ہیں، لغت کی مدد سے ان کے بعض اشعار کے لفظوں کے ایک سے زیادہ معنی بتائے جاسکتے ہیں، غالب کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ان کے اشعار جہتوں کی شاعری کی خصوصیات لیے ہوئے ہیں۔ میر کی شاعری جہت دار نہیں ہے جبکہ غالب کی شاعری جہت دار ہے، اپنی معنی خیزی سے ہر تجربے کو محسوس بناتی ہے۔ درد و غم کے تجربے اور اہو اور آتش کے پیکر اردو کے کم و بیش تمام اہم روایتی اور کلاسیکی شاعروں کے کلام میں موجود ہیں لیکن صرف غالب ہی اپنے وسیع تہہ دار اور جہت دار جمالیاتی وِژن سے اردو کی بوطیقا کو ٹرمبیڈی کی جمالیات کا ایک ڈراما پیش کر سکے۔ یہ میر یا مصحّحتی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان سے یہ توقع رکھنا بھی غلط ہے۔ وہ اس قسم کا کوئی ڈراما یا ایسی کوئی تمثیل پیش نہیں کر سکتے تھے۔

یہ ”شخصیت“ کا معاملہ ہے!

”لہو اور خون“ کے تعلق سے غالب کے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں ان سے غم کے

عرفان، زمانے کی جگر کاری اور نشاطِ زیست کی پہچان ہوتی ہے۔ لہو کے اس جمالیاتی پیکر اور استعارے کے ساتھ زخم، گریہ، ماتم، نالہ، حسرت، آبلہ، فرقہ، داع غنہاں، رنج، درد و الم، وحشت، غم پہباں، لذتِ الم، چاکِ جگر، احتیاط و جنوں، جراحتِ دل اور جوشِ اشک سب کے حصی اور جمالیاتی تصوّرات وابستہ ہیں:

یک مشت خون ہے، پر تو خور سے تمام دشت
درد طلب بہ آبلہ نادبیدہ کھینچ
(غالب)

لہو کے پیکر یا استعارے کے ساتھ اردو شعریات کا کوئی شراب تک اس کے قریب نہ آ سکا! غالبِ تربیحی کی جمالیات کے ایک بڑے فنکار ہیں، میرنہیں ہیں۔ میرالمیہ کے حسن کو پیش تو کرتے ہیں لیکن اسی حد تک کہ جس حد تک وہ کلاسیکی اور روایتی تصوّرات اور تجربات کو تازگی بخشنے ہیں۔ درد و غم کا اظہار ہو یا لہو کے استعارے کا استعمال، وہ اکثر ایک ہی قسم کے تجربے کو دہراتے رہے ہیں۔ مثلاً دل کا قطرہ خون بننا، پلکوں پر رہ جانا یا ٹپک جانا۔ اس تجربے کو بار بار دہرا�ا ہے:

دل نہ پہنچا گوشہ داماں تلک
قطرہ خون تھا مرہ پر جم رہا

چشم خون بستہ سے کل رات لہو پھر ڈپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو
کشکش میں بے قراری کی یہ پھوڑا چھل گیا

یک قطرہ خون ہو کے پلک سے پلک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دل غفران پناہ کا

دامن میں آج دیکھا پھر لخت میں لے آیا
ملکڑا کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو آتا ہے جب نہیں آتا

پلکوں پر تھے پارہ جگر رات
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات

کیا دن تھے کہ خون تھا جگر میں
رو اٹھتے تھے بیٹھ دوپھر رات

لیتا ہی نکلتا ہے مرا لختِ جگر اشک
آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے

ہر اشک میرا ہے دُرِ شہوار سے بہتر
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

وے دن گئے کہ آنسو روتے تھے میراب تو
آنکھوں میں لختِ دل ہے یا پارہ جگر ہے

لختِ دل کب تک الہی، چشم سے پُکا کریں
خاک میں تا چند ایسے لعل پارے دیکھئے

جگر ہی میں یک قطرہ ہے سر شک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

غور کیجیے ہر شعر خوب صورت اور دلنواز ہے۔ ہر شعر اپنا خاص حسن رکھتا ہے لیکن ایک ہی موضوع ہے۔ ایک ہی خیال ہے جو مختلف انداز سے ظاہر ہوا ہے، ایک ہی رہنمائی اور رویے کے اشعار ہیں جو اپنی جگہ جمالیاتی تاثر عطا کرتے ہیں۔

ہم نے پچھلے صفحات پر اپنے اور خون کے جو جمالیاتی تجربے کلامِ غالبہ میں دیکھے ہیں ذرا ان پر ایک بار پھر نظر ڈالیے۔ مختلف تیور، مختلف رہنمائی اور رویے، مختلف فکر و نظر اور تہہ دار جمالیاتی 'وِژن' کا گہرایا احساس ہو گا۔ غالبیات میں جو سرچشمہ بجمال ہے وہاں تک کوئی نہیں آیا۔ غالبیات میں ٹریجیدی کا حسن ایک انتہائی فکر انگیز موضوع ہے۔ الیہ پہلو غالبہ کی شاعری کا وہ پہلو ہے کہ جس سے تہہ دار جمالیاتی شعور اور لا شعور کی پراسرار شعاعیں نکل کر دوسرے پہلوؤں تک پہنچتی ہیں اور نئی صورتیں خلق کرتی ہیں۔

غالبہ کی شاعری میں ٹریجیدی کی جمالیات کے مطالعے میں تین رہنمائیات پر نظر رکھیے تو بصیرت بھی ملے گی اور جمالیاتی انبساط بھی حاصل ہو گا۔ یہ تینوں رہنمائیات ایک ہی تخلیقی وِژن کی تخلیق میں اور ایک دوسرے میں جذب ہیں۔ اس سلسلے میں آتش، رنگ اور اپو کے 'آرج ٹائپ' (Archetype) اور حسی پیکروں کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا۔

ایک رہنمائی یہ ہے کہ شاعر کو المیات نے جکڑ لیا ہے۔ وہ شدید داخلی کشمکش میں گرفتار ہے۔ حالات پر گزرنے کی کوشش بھی کر رہا ہے، لیکن حالات اس پر چھتے ہوئے لمحوں کے ساتھ گزرے ہیں، غم اور اپو کی آواز یہ کہتی ہے کہ اس آواز کو ہم جانے کب سے پہچانتے آئے ہیں:

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ ، تمثال دار تھا
(غالب)

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خون ہے اب
اس رہ گزر میں جلوہ گل آگے گرد تھا
(غالب)

”وِژن“ میں جو ہو بھرے پیکر ہیں وہ جانے پہچانے اور محسوس کیے ہوئے ہیں، شعری اور
جمالیاتی تجربوں میں یہ پیکر کچھ دُور جا کر ”لینڈ اسکیپ“ (Landscape) بن گئے ہیں اور
جمالیاتی تمثال یا ”ایمج، نظر آ رہے ہیں۔

”ایک شہر آرزو“ کا ماتم ہے اور تمثال دار آئینے کے ٹوٹنے کا تصور جانے کتنے خوبصورت
نغموں کے ٹوٹنے بکھرنے کا احساس عطا کرتا ہے، اسی شہر آرزو میں دریائے خون ہے، ان
ہی آرزوؤں کا لہو ہے، ”دل سے جگر تک“ کے خیال سے داخلی کیفیت کی ایسی تصویر ابھاری
گئی ہے جس سے گزرے ہوئے المحاو کے ساتھ گزرتے ہوئے المحاو کی ”صورتوں“ کی بھی
پہچان ہو جاتی ہے۔ غالبت کے فن کا تقاضا یہ ہے کہ ایک یا ایک سے زیادہ مجرد لکیروں سے
”وِژن“ کو سمجھ لیا جائے۔

مویں رنگ کا عاشق جب ایک بڑا المیہ کردار بن جاتا ہے تو گل کے رنگ کو پہلے تو
فریبِ تماشا کہنا چاہتا ہے پھر جب شدید داخلی اضطراب اور تصادم کا شکار ہوتا ہے تو اس
رنگ کو گل کا نالہ خونپکا کہتا ہے:

گل غنچگی میں غرقہ دریائے رنگ ہے
اے آگی ، فریبِ تماشا کہاں سنیں

جو تھا سو مویں رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے واۓ نالہ لب خونیں نواۓ گل

یہ آگھی سچائی یا حقیقت کا عرفان ہے، اس میں حسنِ خیال اور حسنِ ادا کے ساتھ باطن میں ماہوی کی لہروں کا ایک مجرد احساس بھی ہے۔ ”فریبِ تماشا“ سے زندگی کی ٹریجیدی کی ایک تصویر بن گئی ہے۔ نشاطِ زیست کے ساتھ غمِ زیست بھی ہے۔ انعامِ زیست کے خیال نے فریبِ تماشا کی اصطلاح سے دریائے رنگ کی حقیقت واضح کر دیا ہے۔ اس اصطلاح سے ’المیہ کا حسن‘ اور ’حسن کا المیہ‘ دونوں سامنے آگئے ہیں۔ غالب کی ٹریجیدی میں ایمانی اندازِ بیان کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، المیہ کردار ایک تماشائی ہے اور حسن، فریبِ تماشا، غالب نے اس حقیقت کو ایک جمالیاتی رمز بنادیا ہے۔ ایمانی اندازِ بیان میں اس رمز کی المیہ صورت کی پہچان مشکل نہیں ہوتی۔

دوسرہ شعر حسن کے المیہ اور پھر المیہ کے حسن کو شدت سے ابھارتا ہے، جس رنگ کے سب عاشق ہیں وہ رنگ، گل کا نالہ خونپکاں ہے۔ آواز اور رنگ کی وحدت نے المیہ کے جمال کا احساس اس لمحے دیا ہے جب جمال کے المیہ کی تصویر باطن کے خونیں عکس سے مکمل ہو گئی ہے۔ یہاں بھی فریبِ تماشا ہے۔ رنگ گل کو لہو کے امیج میں اس طرح جذب کر کے غالب نے المیہ تجربوں میں بڑی تہہ دار معنویت پیدا کی ہے اور ظاہر اور باطن کی صورت کی ایک نئی تصویر بنائی ہے۔

مندرجہ ذیل چند اشعار سے اس بنیادی المیہ ر. جہان کی پہچان ہو جاتی ہے۔ داخلی اضطراب اور باطنی تصادم کے ساتھ موجود کیفیت بھی سامنے آ جاتی ہے:

باغ میں مجھ کونہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوب فشاں ہو جائے گا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، نان گرہ کشا تھا

زہرہ گرایا ہی شام بھر میں ہوتا ہے آب
پرتو مہتاب سل خانماں ہو جائے گا

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مرثگاں کا
کہ ہر اک قطرہ خون دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدہ خون نابہ فشاں اور

درود لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خونچکاں اپنا

رگ و پے میں جب اترے زہر غم، تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

غونچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

جلوہ گل نے کیا تھا واں چدائیاں آبجو
یاں روں مرثگاں چشم تر سے خون ناب تھا

گر نگاہ کرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں، جیسے خون رگ میں، نہاں ہو جائے گا

‘موجود کیفیت’ اور گزرتے ہوئے المحول کی شدید چھین اور داخلی تصادم اور ہیجانات کے یہ تجربے غور طلب ہیں، افرادگی اور مایوسی بھی ہے اور آنے والے المحول کی گہری تاریکی کا احساس بھی ہے۔ پہلے شعر میں المیہ کرداروں کے پورے وجود کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ رُد عمل سے اس تصویر کے نقوش تحریدی لکیروں میں مختلف ذہنوں میں مختلف انداز سے ابھریں گے۔ ہر ذہن میں زخمی روح اور زخمی اور لہو لہان پیکر کی صورت الگ ہوگی۔ ‘موجود کیفیت’ کا اثر باغ کے ہر گل پر ہوتا ہے۔ فرد کی باطنی کیفیت خارجی حسن سے ایک پراسرار رشتہ رکھتی ہے۔

دوسرے شعر میں المیہ کردار کی بُسی ملتی ہے۔ ناخن میں گرہ کشائی کی طاقت باقی نہیں رہی جبکہ زندگی میں ہر لمحہ ایک گرہ پڑتی جا رہی ہے، ماضی کی آسودگی کی یاد درماندگی کے شدید احساس کے ساتھ ابھری ہے، غالبہ کے المیہ تجربوں میں جدا ای اور ہجر کے تجربوں کو نمایاں حیثیت دینا چاہیے۔ غزل کے اس روایتی لفظ میں غالبہ نے تہہ دار معنویت پیدا کی ہے اور اپنے المیہ تجربوں میں اس لفظ کو نئے مفہوم عطا کر کے جانے کتنے احساسات کو روشن کیا ہے۔ ہجر، داخلی شکمش اور بے پناہ بے چینی اور اضطراب اور میکانیت اور جذباتیت کے تصادم کا اشارہ ہے جس سے شوق اور آرزوؤں کی کیفیت کے ساتھ وحشتِ آتشِ دل اور آرزوؤں کی شکست کے تماثیل (Images) بھی سامنے آئے ہیں۔

میر کے شعر میں غم، کرب، درد اور داخلی اضطراب کی کیفیت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، خوف اور خواہش دونوں ایک دوسرے میں جذب ہیں۔ باطنی کیفیتوں کا اثر پورے معاشرے اور خارجی عناصر اور مظاہر فطرت پر ہوتا ہے۔ اندیشه اور ڈر سے جس نشاطِ غم کو محسوس کیا گیا ہے وہ تحت الشعور میں موجود ہے۔ چاندنی کے طوفان اور سیلا ب کا ‘ایج’،

غیر معمولی ہے۔ اپنے غم اور اس غم کے رد عمل کو شاعر کس طرح اور کہاں کہاں اور کس انداز سے دیکھ رہا ہے اس پر غور فرمائیے۔ الیہ کردار کو اپنے وجود کے پھیلاؤ اور اپنی انفرادیت کا احساس ہر وقت رہتا ہے، اس خیال کے پیش نظر ایسے اشعار پر غور کرنا چاہیے، چنانہ اس کے وجود میں ہے، یہ خود اس کا وجود بھی ہے اور اس کا آئینہ بھی۔ اس کے پھیل جانے کے احساس اور چاندنی کے سیلا ب یا طوفان کے 'امیج' سے الیہ کردار کے وجود کا تصور وابستہ ہے۔ چوتھے شعر میں نشاطِ غم کی تصور یا چھوٹی ہے۔ لمحوں کی چھن بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے اور الیہ کردار کے اضطراب کی بھی پہچان ہو جاتی ہے۔ ہر قطرہِ خون میں سوراخ کرنے کا مسلسل عمل جاری ہے۔ شاعر اس کیفیت میں بھی نشاط کا ایک پہلو پایتا ہے، ہر قطرہِ خون دانہ مر جاں کی طرح قیمتی بھی ہو گیا ہے۔

'موجود حالت' یا 'موجود کیفیت' اور شکست و ریخت کی ان تصویریوں سے ایک الیہ رجحان واضح ہوتا ہے۔ اس رجحان سے غالب کے 'وڑن' نے ٹربیحیٰ کی جمالیات کے جانے کتنے پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ زمانے کی شکست و ریخت، عشق کے کچوکے، انسان کی تاریخ میں ٹربیحیٰ کی کیفیت۔ ان کے پیش نظر ان اشعار کا تجزیہ کیجیے تو غم ایک محیط اور ہمہ گیر حقیقت نظر آئے گا اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ غم کے عرفان نے نشاطِ زیست اور مسرت آمیز بصیرت کو کس طرح پیدا کیا ہے۔ غم کے عرفان اور نشاطِ زیست میں ٹربیحیٰ کا حسن ملتا ہے۔ رنگوں، آوازوں اور حرکتوں کی اس خوب صورت دُنیا کے عشق کے یہ تجربے ہیں جو الیہ کے جمال کے ساتھ ابھرے ہیں۔ غالب نے یہ نہ کہا ہوتا:

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجیے خیال
دیدہ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے

گردشِ ساغر صد جلوہ رنگیں تجھ سے
آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے

بجھنے ہے جلوہ گل ، ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

زبان پہ بار خدا یا ! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بو سے مری زبان کے لیے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے رنگِ لالہ و گل و نرسِ جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

تو ایسے الیہ تجربے بھی پیش نہ ہوئے ہوتے، کائنات، زندگی اور محبوب سے محبت کرتے
ہوئے جب وہ اچنپی اور اذیت ناک لمحوں سے گزرتے ہیں تو یہ حسی الیہ شعری تجربے سامنے
آتے ہیں۔ المنا کی حد درجہ بڑھ جاتی ہے تو الیہ تجربوں میں بڑی شدت، ہمہ گیری اور تہہ داری
پیدا ہو جاتی ہے:

کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے
بے تکلف، اے شرارِ جستہ ! کیا ہو جائیے

باغ پا کر خفگانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایہ شاخ گل ، افقِ نظر آتا ہے مجھے

مُدعا مُحِبٌ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

دل خوں شدہ کشکش حضرتِ دیدار
آئینہ بہ دستِ بتِ بدستِ خنا ہے

در هجر طرب بیش کند تاب و تم را
مهتاب کف مارِ یاہ مت شبم را

ہر انج، ذوقِ نظر اور وِژن، کی صنم سازی کا عمدہ اور عظیم تر نمونہ ہے۔ آخری شعر کے
‘انج’ کی مثال خود غالبہ کے کلام میں اور کہیں نہیں ملتی۔ غالبہ کے وِژن نے سرخ رنگ کو
اکثر اتنا گاڑھا کر دیا ہے کہ ‘سیاہ رنگ’ کے پیکروں کی تخلیق ہوئی ہے اور بات صرف ‘زلف’
تک نہیں رہی ہے۔ ‘افعی’ کے پیکرنے علامیہ بن کر جانے کتنے حصی تجربوں کی اہروں کا احساس
أبھارا ہے اور انھیں بیدار کیا ہے۔ یہ بھی نہ بھولئے کہ سانپ ایک قدیم علامت ہے اور اجتماعی
لاشعور میں مختلف صورتوں اور پیکروں میں موجود ہے۔ سانپ کے پیکرنے ان کے مجرد
احساساتی جمالیاتی رجحان کو اور واضح کر دیا ہے۔ مغلوں کے زوال اور ایک بڑے نظامِ زندگی
کی ویرانی کو ایک کھنڈر تصور کیجیے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے غالبہ کے وِژن پر غور فرمائیے:

با غ پا کر خلقانی یہ ڈرا تا ہے مجھے
سایہ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے

تو یہ محسوس ہوگا کہ شاعر کا باطن ہی ایک کھنڈر ہے جہاں سایہ شاخِ گل افعی نظر آ رہا ہے۔
معاشرے کا الیہ باطن سے علیحدہ نہیں ہے۔ اسی طرح کہ جس طرح کل سانس کی خوشبو اور
نکھٹِ گل میں ایک ہی بات تھی۔ الیات میں جکڑ جانے کے بعد الیہ کردار میں ڈر اور خوف

بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اس المیہ رجحان کا یہ ایک لطیف پہلو بھی ہے۔ غالبت کے خصی تجربوں میں یہ بات بھی ہے، خارجی عناصر مختلف صورتیں تبدیل کر کے اس المیہ کردار کو ڈراٹے بھی ہیں، یہ عناصر جانتے ہیں کہ یہ خوف زدہ ہو جائے گا، اس خیال کے پیش نظر اس شعر کو پھر پڑھئے:

بانغ پا کر خفتانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایہ شاخ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے

اور المیہ کی شدت اس شعر میں اور بڑھ گئی ہے:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

فارسی کے شعر میں حسن، محبوب، معاشرہ یا زمانہ اور خود اپنی ذات سے جدا ہی کا تاثر ابھارا ہے:

در ہجر طرب بیش کند تاب و تم را
مہتاب کف مار سیاہ مست ششم را

مہتاب یا چاندنی سامانِ عیش و طرب ہے، فراق یا ہجر میں سامانِ عیش سے باطن میں بے چینی اور پیش اور بڑھ جاتی ہے۔ کل چاندنی یا مہتاب نے لذت آمیز لمحے عطا کیے تھے اس سے احساس لذت اور بڑھ جاتا تھا، ایک داخلی تحرک لذت پیدا ہوتا تھا۔ آج ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے مہتاب یا چاندنی میری تاریک رات بن گئی ہے، مار سیاہ کے پھن کی طرح یہ چاندنی میری رات میں آئی ہے۔ کف مار سیاہ کا 'امیج'، غالبت کے 'وزن'، کا ایک غیر معمولی 'امیج' ہے۔ فرمجیدی کی شدت میں اس لمحے اضافہ ہو جاتا ہے، جب سارت (Sartre) کے الفاظ میں "المیہ ہیر و اپنی ذات کو خود پسند کرتا ہے"، المیہ زندگی کو اپنی باطنی زندگی سے علیحدہ نہیں سمجھتا اور تاریکیوں اور کھنڈروں میں اتر کر اپنے باطن کے آئینے کو چکاتا ہے۔ غالبت کے ایسے المیہ تجویں کو صرف کسی خاص پس منظر میں نہ دیکھئے بلکہ انسانی زندگی کی سچائیوں کی ابدی کشکش اور تصادم میں بھی پہچانتے۔ غالبت کو اپنی اذیت ناک زندگی اور مظلومی کا احساس اس طریقہ واتھا کہ درد سے خون گراں طرح ابلے کہ حاکم دادرس کی پلکوں سے نکلنے لگے:

وقت سنت کہ خونِ جگر از درد بجوشد
چند آنکہ چکد از مرثہ داد رس مرا
(غالب)

غالب وجدِ ذوق میں زخم سے گرتے ہوئے نمک کو پلکوں سے چنتے ہیں، بلاشبہ غالبت
نے تغزل کو منفرد المیہ رجحان عطا کیا ہے اور تربیحیڈی کی ایک نئی ڈکشن بھی دی ہے۔ تمام المیہ
تجربوں میں خود کو تماشا بنایا ہے اور ہر تماشے سے لذت حاصل کی ہے اور مسیرت آمیز بصیرت
عطایہ کی ہے۔ المیات میں جکڑ جانے اور تلمخیوں میں گھر جانے کے بعد المیہ کردار کے ایے
تجربے بھی متاثر کرتے ہیں:

بیضہ آسا، ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سرنو زندگی ہو، گررہا ہو جائے

شکستِ ذات کی یہ آواز بڑی جان لیوا ہے۔ محرومیوں نے جو گہری اُداسی دی ہے اور
غم نے جو کچھ دیا ہے ان سے داخلی ویرانی کا اساس ہوتا ہے، نئی زندگی کا یہ خواب جمالیاتی
کیفیتوں کو سمجھتا ہے۔ موجودہ کیفیت کو زندگی کی اس تصویر سے سمجھا جا سکتا ہے جو قفس کی
عامت میں نظر آ رہی ہے، کسی لمحے یا احساس ملتا ہے:

مثال یہ مری کوشش کی ہے، کہ مرغ اسیر
کر قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

غالب نے اپنے اس بنیادی المیہ رجحان کو اس طرح بھی واضح کیا ہے کہ زمین اور
آسمان دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں۔ تقدیر نے مجھے ان دونوں کے بیچ رکھ کر
پیس دیا ہے:

دانم کے دوختند زمیں را بہ آسمان
آن گونہ دادہ اند مرا درمیان فشار
(غالب)

بلندی اور پستی کے درمیان اس المیہ کردار کے کرب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بلندی

اور پستی کے بیچ فرد کے کچلنے کا یہ منظر ناپائیدار زندگی اور معاشرے کے عمل اور فرد کی داستان لے کر آیا ہے۔

غالب کا دوسرا بنیادی المیہ رجحان حسرت، خواہش، تمنا، شوق اور جنوں کا رجحان ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالبیات میں المیات کا یہ رجحان بھی بہت اہم اور انتہائی معنی خیز ہے۔ زندگی سے بے پناہ محبت، حسن پسندی کے زبردست میلان، آزادی کی بے انتہا خواہش اور نشاطِ زیست کو حاصل کرنے کے بے پناہ شوق نے اس رجحان کو بڑی شدت عطا کی ہے۔ غالباً کی جمالیات اور غالباً کے الیہ کے جلال و جمال کے دونوں پہلوؤں کے مطالعے کے لیے یہ موضوع انتہائی فکر انگیز ہے۔ حسترتوں، خواہشوں اور تمناؤں کی مختلف صورتوں سے الیہ کی گہرائی اور نشاطِ غم کا اندازہ ہو گا۔ حستر لذت آزار سے تاریکیوں کے سفر (Dark Voyage) کے المناک تجربوں کی کیفیت معلوم ہوتی ہے:

حستر لذت آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راۂ وفا ، جز دم شمشیر نہیں

حستر لذت آزار اور زمانے یا عشق کے مظالم کی کشمکش میں جمالیاتی جوہر ہے وہ توجہ چاہتا ہے۔ زندگی کی لذتوں کو حاصل کرنے کی آرزو زمانے یا عشق کی کشمکش سے حستر لذت آزار پیدا ہوتی اور اسی حستر آزار اور عشق یا زمانے کے تصادم سے تڑپ تڑپ کر اور سک سک کر مرنے کی آرزو کا خاتمه ہوا جا رہا ہے۔

اس المیہ رجحان نے جانے کتنے تجربوں کو جلال و جمال کو ابھارا ہے اور پیش کیا ہے:
گوہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر وینا مرے آگے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کے تکرار کیا کریں

سنجھنے دے مجھے اے نا امیدی، کیا قیامت ہے
کہ دامنِ خیال یارِ چھوٹا جائے ہے مجھ سے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پ پ کہئے کہ آرزو کیا ہے

خوب ہو کے جگر آنکھ سے ڈپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

طبع ہے مشاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

پلا دے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گرنہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

کانٹوں کی زبان سوکھ گئی پیاس سے یارب
ایک آبلہ پا وادی پُر خار میں آوے

جاتا ہوں داغِ حستِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشته ، درخورِ محفل نہیں رہا

دل لگی کی آرزو بے چینِ کھنچی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشته ہے

آتشِ کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہماں سے
اے دائے ، اگر معرضِ اظہار میں آوے

خارِ خارِ الْمِ حستِ دیدار تو ہے
شوّقِ گھنیں گھٹانِ تسلی نہ سبی

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوں
زلفِ سیاہِ رُخ پر پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
مرے سے تیزِ دشنهِ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ میسے گلستان کیے ہوئے

ان کے ساتھ جینے کی آرزو، نئی تخلیق کی خواہش اور شوق اور جنوں کے شعری تجربوں

پر نظر رکھئے تو الیہ کے اس رجحان کی ہمہ گیری اور تہہ داری کا علم ہو جائے گا، حسرتوں اور تمباوں کی دنیا میں ایک ایسے الیہ کردار کی پہچان مشکل نہیں ہوگی جو سک سک کر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے، رنگوں اور روشنیوں کی اس دنیا کا عاشق ہے۔ لذتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے، حس پر فریفته ہے، سینے میں جانے کتنے تجربوں کی آگہ جلائے بیٹھایہ سوچ رہا ہے کہ اگر ان کا اظہار ہو جائے تو ہر جانب آگ لگ جائے۔ جو سینے کے ہر داع غور و شدن دیکھ رہا ہے۔ شکست آرزو کے ساتھ اپنی شکست کی آواز بھی سن رہا ہے اور پھر بھی یہ چاہتا ہے کہ سارا حسن اس کے باطن میں سمٹ آئے، اپنے کھوئے ہوئے سائے کو پالے، وصل سے جس کی بے قراری اور بڑھ جاتی ہے:

(شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد)

ہوا وصال میں شوقِ دل حریص زیادہ

لب قدح بے کف بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

جو یہ سمجھتا ہے کہ ایک خواہش کی تسلیم بہت سی خواہشوں اور تمباوں کو بیدار کرتی ہے اور جو وصل سے زیادہ حسرتِ وصل میں لذت پاتا ہے:

واماندہ ذوقِ طربِ وصل نہیں ہوں

اے حسرتِ بسیار، تمبا کی کمی ہے

یہ الیہ کردار ناکرده گناہوں کی حسرت لیے سوچتا ہے کہ ان گناہوں کی سزا ملنی چاہیے جن کی حسرت میں دل میں رہ گئی ہیں۔ انتظار کو تمبا اور آرزو کہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں میں شوقِ گریہ دریا کی مانندیا اس کی شکل میں موجود مار رہا ہے، اس کے لہو سے کانے شاخِ گل کی طرح سرخ ہو گئے ہیں اور صحراء گلتاں بن گیا ہے:

لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخِ گل

تاقند با غبانی صمرا کرے کوئی

وہ اس قدر روتا ہے کہ اس کے لہو سے بیباں لالہ زار بن جاتا ہے اور اسے دیکھ کر سوچتا ہے

کہ ”ہماری خزان دامنِ صحرائی بہار ہو گئی ہے۔“

گرستیم آنقدر کرن خون بیابان لالہ زاری شد

خزان ما بہار دامن صحراست پنداری

جس کے شوقِ دیدار کا مدعایہ ہے کہ گردن کٹ جانے کے بعد بھی گلِ شمع کی طرح نگاہیں
پھیلی جاتی ہیں، حسن کو دیکھنے کا شوق اور بڑھ جاتا ہے، اس کے جنون کی کیفیت یہ ہے:

اثر آبلہ سے جادہِ صحرائے جنوں

صورتِ رشتہ گوہر ہے چدائیاں مجھ سے

اور داخلی اضطراب کی حالت یہ ہے:

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسے

پاسِ مجھ آتشِ بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے!

حرتوں اور آرزوؤں اور شوق اور اضطراب کے اس پیکر کے اس عقیدے کے پس منظر میں
اس کے الیہ کو سمجھا جائے تو حسن اور رنگوں کی اس کائنات سے اس کے عشق کی وجہ بھی سمجھ
میں آئے گی اور اس کی تربیتی کے حسن و جمال کا بھی احساس گھرا ہو گا:

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ

طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ

بخشش ہے جلوہ گل، ذوقِ تماشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے

طاقت کہاں کہ دید کا احساس اٹھائیے

ساغر جلوہ سرشار ہے ہر ذرہ خاک
شوق دیدار بلا آئینہ سامان نکلا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس وال نکبتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
زندگی کے حسن اور تمام رنگوں کے شدید احساس کے ساتھ غالب نے اپنے الیہ پیکر کو ان
رنگوں کے جمال سے علیحدہ کر کے بھی دیکھا تھا:

فرش سے تاعرض وال طوفان تھا مونِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسمان تک سوتھن کا باب تھا

جلوہ گل نے کیا تھا وال چڑاغاں آب جو
یاں روں مژہ گانِ چشم تر سے خون ناب تھا

بانگ میں مجھ کونہ لے جاؤ نہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خون فشاں ہو جائے گا
الیہ کردار کے حسن کے تصور میں ان ہی باتوں کی وجہ سے بڑی تہہ دار معنویت پیدا
ہو گئی ہے۔ اس کی انانیت، انتہا پسندی، آزادی، حسن پسندی اور حسن سے وابستگی، اس کی
محبوبیاں، اس کی حررتیں اور تصادم اور شکش کی کیفیتیں۔ یہ سب غور و فکر چاہتی ہیں۔ اس
لیے کہ ان ہی المیات کی جمالياتی قدر یہی خلق ہوئی ہیں۔ غالب کے اس دوسرے رجحان
میں ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ الیہ کردار نے کوئی راہ متعین نہیں کی ہے، وہ صرف ایک
جانب نہیں دیکھ رہا ہے۔ ہر جانب دیکھ رہا ہے۔ بہت سی راہوں پر گاہ مزن ہے۔ ہر لمحے کا
تاثر نچوڑ رہا ہے، اس کی دروں بنی متاثر کرتی ہے۔ اس کی سوچ کی مختلف لہریں متاثر کرتی

ہیں، سوچ کی یہ لہریں انتہائی معنی خیز، بصیرت افروزا اور مسرت آمیز اور لذت آمیز ہیں۔

اس بنیادی المیہ رجحان کا ایک پہلو تو حسرتوں اور آرزوؤں کی دنیا ہے اور دوسرا پہلو فرد کی آزادی کے احساس، نئی تخلیق کے شوق، باطن کے آتش کدھ کو روشن رکھنے اور خارج کو باطنی لبروں سے متاثر کرنے، مختصر زندگی کے احساس کے ساتھ ہرشے کو اپنے وجود کا آئینہ بنانے کی مسرت آمیز اور بصیرت افروز داستان ہے، مذہب، اخلاقی نظام کے اقدار اور تصور کی روشنی میں اس پہلو میں موجود ہے۔

غالب کہتے ہیں کہ جس میں تھوڑا سا ہودار کی رونق بننے کے لیے، اگردار کی رونق نہ بنے تو یہ چلو بھرخون خشک ہو جائے گا۔ شرط اضراب ایسی بھی ہے:

شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا
شعلہ جوالہ ہر اک حلقة گرداب تھا

دل کی تپش سے بادل کا جگرٹوٹ کر پانی ہو جاتا ہے اور اس پانی میں جو بھنوڑ پڑتے ہیں وہ شعلہ جوالہ ہیں۔ گھومتے ہوئے مشعل کے حلقات کے اس 'امیج' سے دل کی آتشیں کیفیت کو سمجھا گیا ہے، اس شعر سے جیئنے کی آرزو اور ایک نئی روشنی کی تخلیق کے رجحان کا علم ہو گا:

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تختم ہے سروچ راغواں کا

باطن کے تمام تجربوں کی روشنی سے تماشا دکھانے کی آرزو بھی ہے اور اس کا بھی احساس ہے کہ زمانے کا ظلم و ستم جاری ہے، یہ سلسلہ ختم نہیں ہو رہا، المیہ کردار ہر لمحہ صلیب پر چڑھا ہوا ہے:

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبت
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

اس دوستگاں باوصف سامان بے تعلق ہیں
صنوبر گستاخ میں بادلی ازادہ آتا ہے

مراشمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے
میں مدعا ہوں تپش نامہ تمبا کا

لالہ و گل دمداز طرف مزارش پس مرگ
تا چہا درد دلی غالب ہوں روئے تو بود

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ معیجه رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا
تو کہے صحراء غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

خوں ہو کے جگر آنکھ سے پکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے

ان اشعار سے اس بنیادی المیہ رجحان کے دوسرا پہلو کو سمجھا جا سکتا ہے۔ حسن کو

سمجنے کی آرزو دیکھئے کہ مرنے کے بعد قبر پر پھولوں کی صورت میں یہ آرزو ابھرائی ہے۔
شوق کی یہ تصویر، خواہش کا یہ آئینہ حسن کے عاشق کی داستان سنارہا ہے۔

اس رجحان کا مطالعہ شر بار آ ہوں اور گھٹ کر رہ جانے کی کیفیت کا مطالعہ بھی ہے۔
اس احساس کا مطالعہ بھی کہ الیہ کردار آزاد ہے، زندہ رہنا چاہتا ہے، نئی تخلیق کا شوق لیے یہ
کہہ رہا ہے کہ رہنے دے مجھے یاں کہابھی کام بہت ہے۔ حالات پر گزرنے کی تمنا لیے
وہ تخلیل میں حالات پر گزر بھی رہا، شمعِ ماتم خانہ کو برق سے روشن کر رہا ہے۔ اس کی رفتار تیز
ہے۔ حبابِ موجود رفتار کو اپنا نقشِ قدم سمجھ رہا ہے۔

غالب کا تیرابنیادی الیہ رجحان یہ ہے:

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

غالب کو پڑھتے ہوئے جب اس رجحان تک آتے ہیں تو ایک عجیب المنک ستائے کا
احساس ہوتا ہے۔ یہ الیہ رجحان بھی غیر معمولی ہے۔ کل فرصت تھی، آج فرصت نہیں تھی!
کچھ ہی دیر پہلے یہ الیہ کردار یہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ دن لوٹ آئیں، فرصت کے وہ لمحے بھی
نصیب ہو جائیں۔ جن لمحوں میں وہ تصویرِ جاناں کے بیٹھا ہے۔ اور کچھ حاصل ہو یا نہ ہو، کم
از کم وہ لمحے تو حاصل ہو جائیں کہ جن میں وہ اپنے خیال اور تصور سے لذت آ میز مرست
حاصل کرے:

جی ڈھونڈتا ہے پھرو ہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصویرِ جاناں کے ہوئے

آج ان لمحوں میں کیفیت یہ ہے:

فرصتِ کاروبارِ شوق کے

ذوقِ نظارہِ جمال کہاں

حسن اور نگلوں، آوازوں اور حرکتوں اور رقص کا عاشق یہ کہتا ہے کہ اس میں نظارہِ جمال
کا شوق باقی نہیں رہا ہے، یہ وہی الیہ کردار ہے جو درسِ تپش دے کر اور جلوہِ زخم دکھا کر لذت

حاصل کر رہا تھا جو جلوہ برق کو ایک نظارہ جمال سمجھ رہا تھا اور ساغر خور شید سے شراب پینا چاہتا تھا جو پروردہ صدر نگ تمثیل تھا اور عکسِ خیال قدمیار پر ہی فریفته ہو گیا تھا، جو یہ پوچھ رہا تھا:

ہے کہاں تمثیل کا دوسرا قدم یا رب

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

اس رہ جان کے پیدا ہونے کی ایک بڑی وجہ ہے کہ تشنگی، کرب، اضطراب اور ناکامیوں اور محرومیوں میں ایسے لمحے بھی آئے جن کے پہلو میں بڑے سانحے تھے، شکست آرزو اور شکست ذات کا ایک رو عمل یہ بھی ہے کہ نظارہ جمال کا ذوق اب باقی نہیں رہا، المیہ کردار تہائی میں اپنے زخموں اور اپنی آرزوؤں کے گاڑھے لہو کو لیے بیٹھا ہے، اپنی شکست کی آوازن رہا ہے۔ ایسے آئینہ خانے میں بیٹھا ہے جہاں صرف اس کی المنا کی زندگی کی پرچھائیاں بڑھتی اور پھیلتی نظر آ رہی ہیں۔

دوسرا بڑی وجہ یہ ہے کہ مختصر زندگی کے کچھ ہی لمحے باقی رہ گئے ہیں، زندگی تیز رفتار ہے، کل جانے کتنے طوفان آئے اور ان کی زد پر اس المیہ کردار نے بے پناہ لذت حاصل کی، آج ان کی زد سے الگ ایک ایسے کنارے پڑا جہاں وہ ہے اور اس کی مجروم حروح روح — اور زندگی کی تیز رفتاری اور کاغذی پیر ہن کا شدید اساس:

 مری تغیر میں منضر ہے اک صورت خرابی کی

 کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

 خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

 پرتو خور سے ہے شب نم کو فنا کی تعلیم
 میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

لغہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

رو میں ہے رخش عمر، کہاں دیکھئے تھے
نے ہاتھ باغ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہگزارِ بادیاں

رفوار عمر قطع رہ اضطراب ہے
اس سال کے حاب کو برق آفتاب ہے

حیرت کاغذ آتش زدہ ہے جلوہ عمر
تبہ خاکستر صد آئینہ پایا ہے مجھے

تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پاہے حنا باندھتے ہیں

میں چشم کشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبد کہ شب نم خورشید دیدہ ہوں

ابر روتا ہے کہ بزم طرب آمادہ کرو
برق ہستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

موت کو زندگی کی محرک سمجھتے ہیں اور موت کو ایک ساتھ دیکھ کر پورے سفر کو
بامعنی سمجھنا چاہتے ہیں:

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنा تو جینے کا مزا کیا

نظر میں ہے ہماری جادہ راہِ فنا، غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاء پریشان کا
زندگی کی برق رفتاری سورج کے آہستہ آہستہ پکھلنے کا احساس، فنا کے تصور اور تعمیر میں
تخذیب کے ساتھ شدید داخلی سنائے اور سنائے کے باطن کے انتہائی شدید اضطراب پر غور
کرتے ہوئے محبوب کی موت کا سانحہ بھی ذہن میں رکھے، اس لیے کہ:
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
محبوب کے مرثیے میں بھی عمر کی ناپائیداری کی بات موجود ہے:
عمر بھر کا تو نے پیاں وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
اس الیہ ر. جان کو اس طرح سمجھتے:

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سبی

سر بر ہوئی نہ وعدہ صبر آزمائے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمثنا کرے کوئی

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی ، غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

فرصتِ کاروبارِ شوق کے
ذوقِ نظارةِ جمال کہاں

آگے آتی تھی حالِ دل پر نہیں
اب کسی بات پر نہیں آتی

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژده وصال ، نہ نظارةِ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

DAG فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یہ مختلف شعری تجربے شبِ غم کے جوش تک لے جاتے ہیں لیکن جلد ہی ویرانی اور
ستائے کا احساس پیدا کر کے عمر کی برقِ رفتاری اور شدید ناکامی اور مجبوری اور محرومی کو سمجھا
دیتے ہیں اور الیہ کردار کے اس بنیادی احساس کو ”جو فرصت نہیں ہے“ میں اُبھرا ہے، مختلف
تجرباتی سطحوں پر ابھارتے ہیں۔

”فرصت نہیں ہے“— یہ ایسا اظہار بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ المناک ماحول میں الیہ کردار مناسب ذریعہ اظہار پانہ رکا ہے۔ یہ کردار کی وہ ادا بھی ہے جس سے اس کی دلی ہوئی جذباتیت اور اس کی شکست کھائی ہوئی لیکن اپنے وجود کا احساس دلاتی ہوئی انفرادیت کی پہچان ہوتی ہے۔ غالباً ان لمحوں میں بھی ”معاشرتی کٹھ پتی“ (Puppet) نہیں بنے اور یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ وہ ہیگل کے الفاظ میں آفاقی اور عالمگیر سچائی کی علامت بن جاتے ہیں۔ غالباً کی ٹربیجیدی میں آپ اسے الیہ کردار کے ”زواں“ (Fall) سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کی دلفریب ادا کی بھی داد دیں گے۔ جس ادا سے اس نے اپنی محرومیوں اور شکستوں اور اپنے زوال کو چھپانے کی نہایت ہی فنکارانہ کوشش کی ہے۔ یہ میلان ”زواں“ ہی نہیں ہے ایک دلفریب ”کلائمس“ بھی ہے۔ اس ”کلائمس“ میں ٹربیجیدی کا حسن زندگی کی برق رفتاری اور شکست کے احساس کے ساتھ مخصوص انداز بیان سے پیدا ہوا ہے۔

”بے دماغی“ کو اسی میلان کے نزدیک دیکھئے، موچ بوجے گل کا یہ عاشق یہ کہتا ہے:

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موچ بوجے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

عدم میں قید و بند سے آزاد اور دنیا کی مجبوریوں کا احساس بھی اس رہجان میں موجود ہے:

دیکھ کر در پردہ دامن انشانی مجھے

کر گئی وابستہ میری عریانی مجھے

ان تینوں رہجانات کے مطالعے کے بعد اس رہجان کا مطالعہ کیجیے اور یہ دیکھئے کہ المناک کے شدید ترین احساس کے ساتھ حیرت کے جذبے کو ابھار کر اسے کتنی خوب صورت الیہ جمالیاتی قدر بنادیا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تصویر کا

کاغذی ہے پیر، ان ہر پیکر تصویر کا

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشودہ و ادا کیا ہے؟

شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟

سبرہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے؟

‘عالم تمام حلقة دام خیال ہے،’ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے— ان ختنی تاثرات کو اسی رجحان اور میلان کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

المیہ کے تجربوں اور ان تجربوں کے حسن و جمال پر اتنی مفصل گفتگو ہرگز نہیں کرتا اگر نام نہادنی تقید کی انتہا پسندی نے گمراہی پھیلا لائی نہ ہوتی۔ اندازہ ہو گا کہ غالبہ کا جمالیاتی شعری تجربہ کتنا قیمتی، کتنا اہم اور کس قدر بلند ہے، المیہ تجربوں میں بھی غالبہ وہاں ہیں کہ جہاں اردو کا کوئی شاعر پہنچ نہ سکا ہے۔ وہ میر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح میر کی بڑائی یا عظمت کم نہیں ہو جاتی، میر غالبہ کے پیش رو ہیں، غالبہ نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔ میر نے تغزل کی آبیاری میں زبردست حصہ لیا ہے، شرنگار رس کے تجربوں کے ایک ممتاز شاعر ہیں، لیکن اور بھی سچائیاں ہیں مثلاً یہ کہ وہ اپنے تجربوں کو بار بار مختلف انداز سے دہراتے رہے ہیں، ایک ہی خیال کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں، ان کی شاعری جہت دار اور پہلو دار نہیں ہے۔ درد والم یا المیہ کے تجربوں میں غالبہ نے ایک زبردست ڈراما پیش کر دیا ہے کہ جیسا ہم نے دیکھا ہے۔ شعور، تخيّل، جذبہ، احساس سب مل کر شاعر کے وسیع اور تہہ دار

‘وژن’ کے تین بیدار رکھتے ہیں۔ غالب کے یہ تجربے میر کے جذبوں کی طرح جمالیاتی ہیں لیکن ہیں بہت اعلیٰ، بلند اور ارفع، المیات کے تجربوں میں بھی وہ ‘گریٹ ونڈر’ (Great Wonder) کے شاعر کی طرح اُبھرتے ہیں، ایک انتہائی وسیع تناظر میں ایک نہایت وسیع ‘وژن’ ڈراما پیش کرتا ہے۔

میر کے کلام میں ڈرامائی کیفیتیں تو موجود ہیں مگر وہ ڈراما نہیں ہے جو غالب کے فن میں ہے۔ غالب کے یہاں تو شاعری پہلے ڈراما بنتی ہے اور پھر فلشن بن جاتی ہے۔ یہ بڑی شاعری کی پہچان ہے۔ الیہ کے تعلق سے جو گفتگو کی گئی ہے اسے ایک بار پھر دیکھ لیجئے، ملاحظہ فرمائیے کہ ڈراما کس طرح خلق ہوا ہے اور پھر یہی ڈراما کس طرح ‘فلشن’ بن گیا ہے!

جو لوگ غزل کی مخالفت کرتے ہیں وہ ‘فارم’ اور ‘بیت’ کے چکر میں زیادہ رہتے ہیں۔ ان کے لیے غالب کی غزل میں ایک جواب کی صورت بھی ہیں اور ایک چیلنج کی صورت بھی، جو لوگ اپنے نظم نگاروں کی فہرست بناتے رہتے ہیں، یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتے کہ ان کا کوئی بھی نظم نگار عمدہ اور جمالیاتی تجربوں کے پیشِ نظر غالب کے پاس کھڑا ہے یا ان کے کلام کا تاثر غالب کے کلام سے بہتر ہوتا ہے۔ اردو نظم میں اقبال کے علاوہ تو ابھی تک کسی قد آور فنکار نے جنم ہی نہیں لیا ہے اور ادبی تنقید میں جب تجربوں کے پیشِ نظر آہنگ اور لفظوں کی شعاؤں کی کیفیتوں کا مطالعہ شروع ہو گا تب ہی سچائی کا زیادہ بہتر علم ہو گا۔

غالب پر کام کرتے ہوئے مجھے میر کی یاد تو اکثر آئی لیکن میں نے میر سے کسی قسم کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، لیکن آج جب میر کا مطالعہ کر رہا ہوں غالب کی یاد بار بار آرہی ہے۔ اس کی وجہ اور واحد وجہ صرف یہ ہے کہ غالب اردو شاعری کے سب سے بڑے جمالیاتی معیار بنے ہوئے ہیں۔ ابھی نام نہادنی تنقید نے جو گمراہی پھیلانے کی کوشش کی ہے اس کے پیشِ نظر خاکسار نے ایک بار یہ بتاویں ضروری سمجھا کہ غالب شاعری کے جلال و جمال کا سب سے اعلیٰ معیار ہیں، جب بھی شاعری کی جمالیات پر گفتگو ہو گی، اس معیار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

O

میر تقی میر اردو کی عشقیہ شاعری کے ایک ممتاز شاعر ہیں، ان کی حیثیت منفرد ہے، انھوں نے عشقیہ کیفیتوں کو انسان کے تمام احساسات اور جذبات پر فوقیت دی ہے اور باطن کے ساتھ کو انتہائی پراثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں غالب کی طرح پیچیدہ اور بھرپور شخصیت کی کیمیاگرمی نہیں ہے، اس کے باوجود شخصیت کی لطافت اور مرستی ممتاز کرتی ہے۔ عشقیہ کیفیات میں یہ لطافت اور مرستی لطف پیدا کرتی ہے۔ میر کی شاعری کا امتیاز یہ نہیں ہے کہ اس میں بلاغت، گہرائی اور بلندی ہے بلکہ یہ ہے کہ اس میں جو احساسات ہیں ان میں کچی چاندی کی چمک ہے۔ ایک بڑی واضح عمومی شاعری ہے کہ جس کی جمالیات مشاہدات کو محسوس بناتی ہے۔

عشقیہ شاعری میں میر صاحب نے جولطیف پراثر اور دلفریب فضائلق کی ہے اس میں ان کے ہمم اور لنشیں لبجھ کی بڑی اہمیت ہے، اس لبجھ میں کبھی کبھی برق کی سی جولہر ملتی ہے وہ شخصیت کے سوز و گداز کی دین ہے، شرنگار رس لیے یہ شاعری عشقیہ تجربوں کا عرفان بخشتی ہے۔ میر کی عشقیہ شاعری میں فراق کی اذیتیں ہیں، تمناؤں کے کچل جانے کے احساسات ہیں، سوز و گداز اور درون بینی ہے۔ خود فراموشی کی کیفیت ہے، وارداتِ قلب کا بیان ہے، ایسے تمام حسی تجربوں میں عام انسانی تجربے ملتے ہیں، جمالیاتی عشقیہ تجربوں میں اکثر ایسی جدت ملتی ہے جس کی تازگی ممتاز کرتی ہے۔

شنگار رس کے اس شاعر نے محبوب کے بدن کو پہلے اس طرح دیکھا:

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اُگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

پہلے شعر میں جو سرگزت اور انبساط (Pleasure and Delight) ہے وہ محبوب کے بدن
کے حسن کے مشاہدے کی وجہ سے ہے۔ محبوب نے ایسا لباس پہننا ہے کہ اس کا تمام بدن
‘اگلا پڑے ہے، دلفریب گداز بدن اپنے حسن کے ساتھ جامے سے باہر اگل پڑا ہے۔
انہتائی خوب صورت اور پیارا منظر ہے۔ حسن کا ری غضب کی ہے، جنسی لذت اندوزی کی یہ
کیفیت بصری حسن کے تاثرات کو بڑی شدت سے ابھارتی ہے۔ شعر پڑھتے ہوئے محسوس
ہوتا ہے جیسے جامے اور بدن کے اس دلکش اور دنوواز نظارے کو دیکھ کر عاشق میں مرستی سی پیدا
ہو گئی ہے۔ دوسرے شعر میں منظر یہ ہے کہ محبوب کے بدن کے ساتھ تنگ جامہ لپٹا ہوا ہے،
جامہ بدن پر چپاں ہے۔ اب جذبے کا رنگ کچھ اور ہو جاتا ہے، جنسی لذت اندوزی کی
کیفیت اور ہو جاتی ہے، خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ خود محبوب کا تنگ جامہ بن کر اس لباس کی
طرح اس کے جسم سے چپاں ہو جائے! آرزو کی شدت متاثر کرتی ہے، لذت آمیز سرگزت
اور انبساط پانے کی یہ آرزو غیر معمولی ہے۔ رشک کا اتنا خوب صورت مضمون خود میر کے
یہاں شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ یہ بھی بصری حسن کے دلکش تاثرات ہیں، یہ تاثرات
جد باتی جنسی ہم آہنگی یا اصل کی آرزو تک پہنچادیتے ہیں۔ پہلے شعر کے پیش نظر دوسرے
شعر میں جنسی آرزومندی اور لذت اندوزی کے تاثرات گھرے ہو گئے ہیں پھر شرنگار رس
کے اس فنکار نے یہ جمالیاتی تجربہ پیش کیا ہے:

تنگیِ جامہ ظلم ہے اے باعثِ حیات
پاتے ہیں لطفِ جان کا ہم تیرے تن کے نیچ

محبوب کے بدن سے لذت پانے کا یہ احساس بھی غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ محبوب کو
تنگ لباس میں دیکھ کر کہا جا رہا ہے کہ یہ ظلم ہے۔ تیرے نازک اور لطیف جسم پر تنگ لباس کا
دباو بڑا ظلم ہے، تیرے تن کے نیچ اپنی جان کو پاتے ہیں لہذا یہ سمجھ کہ تو ہے، تیرا جسم ہے، تیرا

بدن ہے تو میں بھی ہوں، بدن اس طرح پوشیدہ رہے گا تو میری جان نکل جائے گی، تیرے تن کے نیچے میرے وجود کا آہنگ ہے، ظاہر ہے اگر محظوظ یہ تنگ لباس اُتار دے اور بدن کے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہو جائے تو میری جان نیچے جائے۔ محظوظ کے بدن کو دیکھنے کی آرزو سے یہ جمالیاتی تجربہ خلق ہوا ہے۔ اس شعر میں بھی وہی سادگی اور پرکاری ہے جو میر کے بیشتر اچھے اشعار میں ہے۔ تجربوں کی زرخیزی کلامِ میر کی ایک بڑی جمالیاتی خصوصیت ہے۔ اس شعر کا حسن اس جمالیاتی تاثر میں سمٹ آیا ہے کہ عاشقِ محظوظ کے وجود میں جذب ہے اور وہ اس کیفیت کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا۔ محظوظ بے لباس ہو جائے تو اس کے تن کے نیچے عاشق بھی نظر آنے لگے، غور کرتے جائے تجربے کی زرخیزی متاثر کرتی جائے گی۔

میر اگر شرنگار رس کے ممتاز شاعر ہیں تو اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری کا عاشق ان اشعار کے جمالیاتی تجربوں سے اور بھی آگے بڑھ کر محظوظ کے جمال سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ محظوظ کا بدن، شرنگار رس لیے، احساسِ جمال کا موضوع اس طرح بنایا ہے:

بدن میں اس کے تھی ہر جائے دلکش

بجا بے جا ہوا ہے جا بجا دل

محظوظ کا انگ انج حسن کا دلکش نمونہ ہے، حسن کو محسوس کرنے، دیکھنے، ٹھوٹنے اور چکھنے کی باتیں جیسے کیجا ہو گئی ہیں۔ ”دل، عاشق کا علامیہ ہے۔“ محظوظ کے ہر عضو یا ہر انگ کو دیکھنے، چھونے، ٹھوٹنے، چکھنے کے لیے دل کی بے قراری حد درجہ بڑھ جاتی ہے۔ عاشق بے قابو ہو جاتا ہے، کبھی ایک انگ یا عضو کے حسن کو دیکھتا، محسوس کرتا اور ٹھوٹتا ہے اور کبھی دوسرے انگ یا عضو کو۔

”شنگار رس“ کے ایسے تجربوں میں جہاں بصری حسن اور بصری تاثرات کے ساتھ حسِ حرکت اور حسِ حرارت کی اہمیت ہے وہاں لمحیت اور جنسی لذت اندوزی کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، ان سے بھی حسن کے تینیں بیداری پیدا ہوتی ہے اور جمالیاتی انبساط ملتا ہے، ان خصوصیتوں سے بھی اردو غزل میں میر کی جمالیات کو ممتاز درجہ حاصل ہوتا ہے۔

”شرنگارس“ کے اس شاعر نے ابھینوگپت کے اس خیال کے پیشِ نظر بھی دلفریب اور لذید تجربے پیش کیے ہیں کہ ”شرنگار،“ شرنگ (Shringa) سے انکا ہے کہ جس کا مفہوم ہے جس کا گہرا اثر سیکس کی جبلت پر ہو! یعنی وہ تجربہ جو عشق کا حامل ہو اور سیکس کی جبلت کو متاثر کرے وہی شرنگار ہے۔

میر نے تو تین مناظر پر مشتمل ایک ڈراما پیش کر دیا ہے:
منظراً ایک:

ہے فروغِ مہتاب سے فراغ کلی
دل جلے پر تو رُخ سے مرے مہتاب میں ہیں

منظراً دو:

شب نہاتا تھا جو وہ رشکِ قمر پانی میں
تحتی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں
ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن
جیسے جھمکے ہے پڑا گوہر تر پانی میں

منظراً تین:

پانی بھرا آیا منہ میں دیکھے جنھوں کے یارب
وے کس مزے کے ہوں گے لب ہائے نامکیدہ
اب کچھ مزے پر آیا شاید وہ شوخ دیدہ
اب اس کے پوست میں ہے جوں میوہ رسیدہ

رومانتیت میں آہستہ آہستہ کب پھیلا آیا ہے غور کیجیے۔ حسی تجربہ آہستہ جنسی تجربہ بنा ہے، تیرے منظر میں جنسی تجربہ غیر معمولی بن گیا ہے۔

محبوب کے بدن اور اس کے پورے وجود کے تعلق سے احساسِ حسن شدت سے متاثر کرتا ہے۔ میر کی رومانتیت ”چاندنی کی ٹھنڈک“ اور ”پانی کی لہروں میں چاند کی کرنوں کی

جد باتی کیفیت،“ میں اچھی طرح نمایاں ہوئی ہے۔ تیرے منظر میں سیکس، کا تجربہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

شنگارس کے اس شاعر نے حسن کو اس طرح بھی دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ انسان کے وجود کے اندر ہی حسن کا مرکز اور سرچشمہ ہے۔ اپنے اندر دیکھ لے تو اسے اس سچائی کا علم ہو جائے۔ مرتضیٰ آمیز بصیرت اسی وقت حاصل ہوگی جب گردا ب کی طرح بھر حسن کی پہچان ہو جائے، دیکھنے گردا ب خود اپنا دیوانہ بن گیا ہے۔ سبب یہی ہے کہ اس نے اپنے اندر بھر حسن کو دیکھ لیا ہے۔ قص گردا ب کی کیفیت غیر معمولی نوعیت کی ہے، اس کیفیت کی معنویت کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے:

اس بھر حسن کے تیس دیکھا ہے آپ میں کیا
جاتا ہے صدقے اپنے جو لحظہ لحظہ گردا ب

قص گردا ب میں جو کیف و سرور ہے وہی کیف و سرور پیدا ہو جائے تو انسان بھی حسن کا نظارہ کر کے اور نظارہ کرتے ہوئے خود اپنے اوپر فریفتہ ہو جائے، حسن اس کے وجود کے اندر ہے، اس شعر میں تخیل کی شادابی ایسی ہے کہ حسن حقیقی انسانی وجود کا حصہ بنا نظر آنے لگا ہے، یہاں شاعرانہ نگاہ میا ویژن (Poetic Vision) شاعر کے تخیل کی زرخیزی کا احساس دلاتا ہے۔ ایسے اشعار میں جو ڈرامائی کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ میر کی جمالیات کا ایک بڑا اوصاف ہے۔

شنگارس کے اس شاعر کی رومانیت نے دل یا انسان کے وجود کو بڑی اہمیت دی ہے۔ یہ رومانی ذہن آزادی چاہتا ہے، کھلی فضا چاہتا ہے، اپنے وجود کو پھیلانا چاہتا ہے، یہ دُنیا اپنی دیواریں لیے ہر طرف گھیرے کھڑی ہے، رومانی ذہن بھلا ایسی دیواروں کے نیچ کیسے رہ سکتا ہے۔ وہ تو پرواہ کی زبردست چاہت لیے ہوئے ہے، اس کا دل ابھی کھلا کہاں ہے، دیواروں کے درمیان بھلا اس کا دل کھلے بھی تو کیسے، یہاں تو آزادی کے احساس کے ساتھ سرست دل لامکاں کی طرف صاف میدان چاہتا ہے:

صاف میداں لامکاں سا ہو تو میرا دل کھلے
تیگ ہوں معمورہ دُنیا کی دیواروں کے بیچ
دل کے تحرک اور قص کے لیے لامکاں کی وسعت چاہیے!

میر کی جمالیات میں اس رومانی ذہن کی بڑی اہمیت ہے جو آزادی کا دلدادہ ہے، اس ذہن میں وسعت کارومنی تصور لامکاں کا تصور ہے۔ یہ دل گھشن اور یکسانیت سے گریز کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی اضطراب ہے، روح کا سوز اس اضطراب کو اور بڑھادیتا ہے۔ یہ دلکش پیارا تجربہ بڑی سادگی سے پیش ہوا ہے۔

شنزنگار رس کے اس شاعر نے جہاں محبت کے جذبے کو جمالیاتی تجربوں کی صورت دی ہے وہاں دُکھ اور لذت کے شدید احساس کو بھی جمالیاتی تجربوں میں ڈھالا ہے۔ دُکھ اور اس کی لذت کا احساس اور شدید احساس بھی محبت کے جذبے ہی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ دُکھ اور دُکھ کی لذت کا احساس جب جمالیاتی تجربہ بنتا ہے تو ”کتھارس“ ہوتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرنا
ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سرخار ہنوز
رغبتِ جنوں میں ممکن ہے اور بھی بہت لوگ گزرے ہوں لیکن ”آبلہ پا گزرنے والا“
تو صرف ایک ہی ہے! شکر ہے کسی نے تو جنوں کی آبرو رکھ لی! خار کے چھپنے سے جو آبلے
پیدا ہوئے انھیں لے کر وہ خار کے اوپر سے گزرنا اور تب سے سرخار لوہو میں ڈوبتا ہی جا رہا
ہے۔

”کوئی تو گزرا“، یعنی صرف ایک میں ہی گزرا!۔ مجھے جیسے عاشق ہی نے زمانے کے آبلوں کو قبول کیا۔ الیہ پیدا ہوا لیکن اس الیہ کا جواب بھی ان ہی آبلوں نے دیا۔ خار کے اوپر سے عاشق یا استم زدہ کیا گزرنا کہ سرخار بھی تک اس کے لہو میں ڈوبتا ہی جا رہا ہے۔ میں نے ایسے ہی اشعار کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ میر صاحب کافن وہاں عروج پر نظر

آتا ہے کہ جہاں زندگی کے تعلق سے شاعر کے تخلیقی رجحان کا جھکاؤ حسن کی تخلیق کرتا ہے، یہاں شعر کے حسن کا جو آہنگ ہے وہ تخلیقی رجحان کو سمجھا دیتا ہے۔ شرنگارس کے اس شاعر نے تخلیل اور فینسی (Fancy) دونوں سے کام لے کر جمالیاتی آسودگی عطا کی ہے۔

شنگارس کے اس شاعر کے المناک تجربوں میں اکثر مشہور نغمہ ”میری روح ماتم کرتی ہے“ (My Soul Mourns) کا آہنگ کسی نہ کسی سطح پر سنائی دے دیتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

لوہو میں شور بور ہے دامان وجیب میر
بپرا ہے آج دیدہ خون بار بے طرح

لہو میں ڈوب ایک پیکر آہستہ آہستہ ابھرتا ہے جسے دیکھ کر حد درجہ اذیت برداشت کرنے کا ایک گھر اتاثر ملتا ہے۔ یہاں ”حد درجہ اذیت“ کا جو رو عمل ہے وہ غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ لہو میں ڈوب اہوا پیکر اور بھی لہو لہان ہوگا۔ اس لیے کہ دیدہ خون بار بے طرح بپرا ہوا ہے، دیکھ لینا دامان وجیب سب لہو میں ڈوب جائیں، مسلسل اذیت کا جو رو عمل ہوا ہے، اس سے ایک نیا منظر سامنے ہوگا جو لہو لہو ہو ہوگا۔ پورا وجود اور دامان وجیب سب لہو میں ڈوب جائیں گے، ”بے طرح بپرا ہوا دیدہ خون بار“ خود اپنے وجود کو لہو سے نہلا دے گا۔ مسلسل اذیتوں کا جو داخلی رو عمل ہوا ہے، وہ خارج کا منظر بن جائے گا۔ وجود بپھرتا ہے لیکن اس کا اثر خارج پر نہیں ہوتا، وجود ہی پر ہوتا ہے بپھرے ہوئے دیدہ خون بار کا جو رو عمل ہوگا وہ بڑا لہو لہو منظر ہوگا۔ وہ صرف اپنے وجود ہی کو اذیت دے سکتا ہے۔ عجیب بے بسی ہے کہ وہ زندگی کے ڈکھ اور المیے کا جواب خود اپنے وجود کو ڈکھ تکلیف پہنچا کر ہی دے گا۔ شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اب جو اس پیکر کا نقش ابھرے گا وہ حد سے زیادہ المناک ہوگا۔ اس شعر کے باطن میں جو ”سنیشن“ (Sensation) ہے وہ جیسے کسی Pleasurable Sensation کو چھو کر چلا آیا ہے۔ یہ میرتی میر کی جمالیات کا ایک اہم نکتہ ہے۔

”شنگارس“ کے اس شاعر کوشش سے محسوس ہوتا ہے کہ ہر جانب جو حسن پھیلا ہوا

ہے اس کا سرچشمہ کہیں اور ہے۔ یہ جو صحیح فلک پر اک نور گرم جلوہ نظر آتا ہے اس سے یہی لگتا ہے کہ رواق پر کوئی ماہ پارہ موجود ہے۔ صحیح ہوتے ہی وہ نور اپنا جلوہ دکھاتا ہے جو گرم ہے یعنی ہر درجہ پر کشش اور وجود میں گرمی پیدا کرنے والا، ہر درجہ دلفریب، لذیذ اور وجود کو تحرک بخشنے والا، صحیح اس نور کے جلوے کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تو ماہ پارہ موجود ہے کہ جس کے جلال و جمال کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ کہتا ہے:

اک نور گرم جلوہ فلک پر ہے ہر سحر
کوئی تو ماہ پارہ ہے میر اس رواق میں

شرنگارز کے اس شاعر نے دُنیا کو ایک طسم کی طرح محسوس کیا ہے کہ جہاں جانے کتنے طسمی پیکر متحرک ہیں، بھانت بھانت کے چہرے ہیں، قدم قدم پر عجیب و غریب خیالات کے متحرک پتے ہیں۔ یہ سب چہرے، یہ سب خیالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس طسم میں حیرت انگیز صورتیں، حیرت انگیز حرکتیں کرتی ہیں، یہ دُنیا اتنی سادہ نہیں کہ بس ایک نظر ڈالنے اور اسے پہچان لیجیے۔ اس کی تخلیق ہی طسم سے ہوئی ہے، ہر جگہ ایک طسم ہے یہاں زندگی بس رکرتے ہوئے قدم قدم طسمی فضاوں سے واسطہ پڑتا ہے:

ہب میت بوجھ یہ طسم جہاں
ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور
(میر)

غالب نے بھی دُنیا اور پوری زندگی کو داستانوں کے طسم کی طرح محسوس کیا ہے، کہتے ہیں
عالم طسم شہر خموشاں ہے سر بہ سر
یا میں غریب کشور بود و نبود تھا
(غالب)

طسم کے تصور سے اس احساس کا پیدا ہو جانا بھی فطری ہے کہ طسم داستانوں کے طسم کی طرح ٹوٹ جائے گا! فریب افسوں اور فریب تماشا کو کون نہیں جانتا!

میر کہتے ہیں کہ اس طسم کو ایک قلندر کی ہوتوڑ دے گی۔ یہ عالم جو آئینے کی مانند چک رہا ہے قلندر کی ہو سے سیاہ ہو جائے:

ہم ہیں قلندر آ کر اگر دل سے دم بھری
عالم کا آئینہ ہے یہ ایک ہو کے پیچ
(میر)

”شرنگار رس“ کا شاعر جب حقیقی حسن یا سرچشمہ حسن سے رشتہ قائم کر لیتا ہے تو دراصل یہ آہنگ اور آہنگ کا رشتہ بن جاتا ہے۔ وہ قلندر بن جاتا ہے، قلندر کے باطن میں حسنِ حقیقی سرایت کر جاتا ہے لہذا جب وہ ہو کرتا ہے تو یہ آہنگ باطن ہوتا ہے، اس میں اتنی توانائی ہے کہ ایک ہو سے عالم کے آئینے کو سیاہ کر دے، سارا طسم بھک سے اڑ جائے!

”شرنگار رس“ کے اس شاعر نے کہا ہے:

ہر جزو مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش
کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش

زندگی کے تعلق سے فنا کار کے تخلیقی رحمان کے جھکاؤ نے حسن کی جو تخلیق کی ہے وہ اس شعر میں جلوہ بنا ہوا ہے۔

ایک تمثیل سامنے ہے، منظر یہ ابھرتا ہے کہ سمندر کی لہریں ایک دوسرے پر مسلسل چڑھتی نظر آ رہی ہیں، ٹکرائی ہیں، لہریں آ رہی ہیں، واپس جارہی ہیں، یہ سلسلہ قائم ہے، ہر لمحہ لہروں کے ٹکرانے اور آنے جانے سے بار بار سوراٹھ رہا ہے۔ جب لہریں ایک دوسرے سے ٹکرائی ہیں تو لوگ رہا ہے جیسے ایک دوسرے میں جذب بھی ہوتی جا رہی ہیں، منظر یقیناً دلکش ہے، لہروں کی آوازوں سے ایک ہنگامہ خیز فضا قائم ہے۔ یہ تلاطم، یہ اضطراب، یہ کیفیت، یہ ولولہ، یہ مرسی، یہ حرکت، یہ انرجی۔ غیر معمولی نوعیت کی ہیں۔ یہ زندگی کی توانائی اور جوش و خروش کی علامت ہے۔ زندگی اسی طرح ٹھائیں مارتی ہے، اسی قسم کا تصادم اور اسی قسم کا کشمکش زندگی میں بھی ہے اور پھر اسی قسم کی جذباتی آہنگی، جذبی کیفیت، جذب

ہو کر گم ہو جانے والی زندگی کا تقاضہ ہے۔ یہ سمندر زندگی کا آئینہ ہے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ اور لہروں کے اضطراب اور ان کے ایک دوسرے میں بار بار مغم ہو جانے کے تماشے سمندر کے اس منظر میں موجود ہیں۔

یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے یہ یوں ہی نہیں ہو رہا ہے، بحر کے اندر یقیناً کوئی راز ہے، زندگی کے اندر یقیناً کوئی اسرار پوشیدہ ہے، اسی اسرار کا یہ خوب صورت رو عمل ہے کہ جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں، راز نہ ہوتا تو یہ جوش یہ خروش کہاں ہوتا۔ یہ کس کا راز ہے یا رب؟ جو اب اس معصومانہ سوال کے اندر ہی ہے، یہ تیراہی اسرار ہے! یہ محبت اور پیار کا اسرار ہے! ساری لہریں جو آرہی ہیں جارہی ہیں، اٹھرہی ہیں، گم ہو رہی ہیں، شور کر رہی ہیں، ایک دوسرے میں جذب ہو رہی ہیں، سب ایک دوسرے سے محبت کو بھی سمجھا رہی ہیں! زندگی کی پراسرار وحدت اور اس کی لذت سے آشنا کر رہی ہیں! زندگی کا عرفان اسی وقت حاصل ہو گا جب سمندر کے اس منظر کا مفہوم سمجھ میں آئے گا، یہ اسرار اے میرے رب تیری محبت کا ہے، میری محبت کا ہے، لہر لہر کی محبت کا ہے، یہ زندگی کا جنون ہے! اس جنون سے رازِ فطرت کی پراسراریت کو سمجھنے کی انتہائی عمدہ شاعرانہ کاوش ہے۔ حسِ حرکت اور حسِ ارار لیے یہ منظر ذہن کو زندگی کے ظاہر اور پراسرار باطن کے اندر اُتا رہتا ہے۔

شرنگار رس کی اصطلاح کے متعلق یہ خیال بھی بہت اہم ہے کہ اس کا تعلق 'شہر' (Shaher) سے ہے، جس کے لغوی معنی ہیں 'مارنا، مار دینا، یعنی اس شخصیت کا خاتمه کہ جسے عشق کا تجربہ حاصل ہوا، جس نے عشق کیا بس سمجھواں کا قتل ہوا۔ اچھے عاشق کو اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ راہِ عشق میں اس کا قتل ضرور ہو گا اور اس کے لہو کی خوشبو رہتی دنیا تک موجود رہے گی۔

شنگار رس کے اس شاعر نے ایک پیار اسابہت واضح صاف شعر کہا ہے:

شش جہت سے اس میں ظالم بوئے خون کی راہ ہے

تیرا کوچہ ہم سے تو کہہ کس کی بُمل گاہ ہے

تیرے کوچے میں ہر جانب سے بوئے خون آرہی ہے، اے میرے محبوب میرے

قاتل یہ تو بتا کہ تیرا کوچہ کس کی بُل گاہ بنے والا ہے؟ عاشق جانتا ہے کہ اسی کا قتل ہونا ہے لیکن معصومانہ انداز میں انتہائی پیار سے اپنی قربت کا احساس دلاتے ہوئے کہتا ہے ”ہم سے تو کہہ، یہ کس کی بُل گاہ ہے۔ اس انداز میں جو طنز چھپا ہوا ہے اسے بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات تو نئی نہیں ہے کہ عاشق قاتل ہوتا ہے، جو محبت کرتا ہے اسے اپنی جان کی قربانی دینا پڑتی ہے، لیکن اس خیال میں لہو کی بوئے جو بات پیدا ہوئے ہے اس سے تجربہ بڑا پرکشش بن گیا ہے۔ پہلے ہی سے لہو کی بوہر جانب سے آ رہی ہے، ظاہر ہے کسی کا قتل ہونا یقینی ہے، کون ہے وہ؟ عاشق جانتا ہے کہ قتل اسی کا ہو گا اس لیے کہ بوئے خون اجنبی نہیں ہے۔ پھر بھی بڑی معصومیت اور پیار سے کہتا ہے ”ہم سے تو کہہ“ تیرا کوچہ کس کی بُل گاہ بنے والا ہے، میر کا انداز شرنگار رس لیے ہوئے ہے:

شنگار رس کے اس شاعر کی رومانیت کا ایک پہلو اس طرح اُجاگر ہوتا ہے:

صاف میدانِ لامکاں سا ہو تو میرا دل کھلے

تنگ ہوں معمورہ دُنیا کی دیواروں کے پیچ

اور دوسرا پہلو اس طرح ہے:

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر

منہ نظر آتا ہے دیواروں کے پیچ

پہلے شعر میں رومانی ذہن اپنے دل کے کھلنے کے لیے لامکاں کی طرح وسعت چاہتا ہے، دل صرف حد درجہ گہرا، ہی نہیں بلکہ حد درجہ وسیع بھی ہے۔ اس محدود دُنیا کے محدود داداً رے میں بھلا اس کی وسعت کہاں سما پائے گی، دل گھٹن کا شکار ہے، معمورہ دُنیا کی دیواروں کے درمیان اس کی گھٹن پریشان کر رہی ہے، وہ ان دیواروں سے باہر نکلنا چاہتا ہے، کائنات سے آگے تک پھیلنا چاہتا ہے، اس شعر میں رومانیت کی سیما بی کیفیت احساس کو چھو لیتی ہے۔ لامکاں جیسے صاف میدان، ہی میں اس کے تحرک کی پہچان ہوگی، تحرک ہی سے تخلیق کا سچا عمل جاری رہے گا، نئی فکر جنم لے گی، تخلیق کا نیا سلسلہ قائم رہے گا۔

دوسرے شعر میں شرنگار رس کا یہ شاعر ایک دوسرے جمالیاتی رویے کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ احساس یہ ہے کہ اگر زگاہ ہو تو یہ دیکھ لینا مشکل نہیں کہ وہ رآئینہ خانہ ہے۔ دُنیا ایک بڑے اور وسیع آئینہ خانے کی طرح روشن اور تابناک ہے، ہر جانب صورت نظر آ رہی ہے۔ پہلے شعر میں معمورہ دُنیا کی دیواروں کے بیچ جو گھٹن تھی، کیسانیت سے گریز کا جور و مانی رویہ تھا وہ یکسر یہاں تبدیل ہو جاتا ہے۔ 'مکاں' کی جانے کتنی دیواریں کھڑی تھیں کہ جن کے درمیان سے اپنے دل کو نکال لینے کی خواہش تھی۔ زندگی کے محدود دو دائرے سے نکل کر وسیع میدان میں آنے کی تمنا تھی، ایسا وسیع صاف میدان جو لامکاں کی طرح ہو، مکاں اور اس کی چہار دیواری میں بھلا وجود کا مکمل اظہار کیسے ممکن ہے۔ دوسرے شعر میں یہ رومانی ذہن مکاں کی دیواروں کو بھی آئینے کی طرح دیکھتا اور پاتا ہے، ان دیواروں کے درمیان چہرہ نظر آتا ہے، ہر جانب وجود کا پیکر موجود ہے۔ خود کو دیکھنے، خود کو پانے اور خود کو جاننے کے لیے دہرا کا آئینہ ہی کافی ہے۔ اس طرح بھی واضح کیا ہے:

جی کو نہیں لاگ لامکاں سے
ہم کو کوئی دل مکاں بہت ہے

یہ شعر بھی سنئے:

گھر دل کا بہت چھوٹا پر جائے تعجب ہے
عالم کو تمام اس میں کس طرح سے گنجائی

'آتش' ایک قدیم کلاسیکی اور روایتی استعارہ ہے۔ آتش اور اس کے تلازموں کو اردو شاعروں نے خوب استعمال کیا ہے۔ غالباً نے اس استعارے کو جمالیاتی آرچ ٹاپ کی صورت دے دی ہے اور آتش کے پیکروں اور علامتوں کے ساتھ بہت دُور نکل گئے ہیں۔ شرنگار رس کے اس شاعر میر نے بھی آتش کے استعارے کو استعمال کیا ہے۔ میر کی شاعری میں آتش صرف آتش عشق ہے، 'محبوب' کی محبت نے آگ لگائی ہے اور باطن جل رہا ہے۔ اس استعارے کے ساتھ میر صاحب نے بعض تجربوں کو کلاسیکی حیثیت دے دی ہے، مثلاً:

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُنھتا ہے
یہ دُوھاں سا کہا سے اُنھتا ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
اک آگ سی رہے ہے کیا جائے کہ کیا ہے
”شرنگارس“ کے اس ممتاز شاعر نے آتش، شعلہ، چنگاری، شر، راکھ، دھواں وغیرہ کا
استعمال کیا ہے۔ یہ عام روایتی اور سمجھی تجربوں میں بھی چمک دمک پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شر رہے

دل سونختہ ہوں مجھ کو تکلیف حرف مت کر
اک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہرخن سے

اب دھواں یوں جگر سے اُنھتا ہے
جیسے پریچ کوئی کاکل ہو

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میر پر
برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

متصل روتے ہی رہئے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

بوئے کباب سوختہ آئی دماغ میں
شاید جگر کو آتشِ غم نے جلا دیا

گرم مجھ کو سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا
آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا
دل نے جگر کی اور اشارت کی، یاں گرا

کہا میں درد دل یا آگ اُگلی
پھپھولے پڑ گئے میری زبان میں

گوبے کسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا
میں جوں چراغِ گور اکیلا جلا کیا

یہ بھی محبت اور غم کے جذبات کے وہ جمالیاتی تجربے ہیں کہ جنہیں شرنگار رس کے ممتاز شاعر نے اپنے دواوین میں پیش کیا ہے۔ آتش اور آگ کے تعلق سے اکثر تجربے رسمی اور روایتی بن گئے ہیں، بہت کم تجربوں میں تحریر کار رس (ادبیت رس) ملتا ہے جو شرنگار رس کی سب سے اعلیٰ صورت ہے۔

اگرچہ غم کے احساس نے آتش اور اس کے تلازموں کو ابھارا ہے، الیہ تجربوں کا معیار بہت بلند نہیں ہوا۔ اس پیٹھوس (Pathos) کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جو میر صاحب کے بعض الیہ تجربوں میں موجود ہے۔ مثلاً:

پیدا ہے کہ پہاں تھی آتش نفسی میری
میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا

آنسو تو ڈر سے پی گئے لیکن وہ قطرہ آب
اک آگ تن بدن میں ہمارے لگا گیا

آگ سی اک دل میں سلے ہے کبھو بھڑ کی تو میر
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلہ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانا گیا

دل بھم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیرا ہن جلا

ایسے اشعار میں بے پناہ تاثیر ہے۔ اشعار کی دلاؤیزی اور نفاست بھی متاثر کرتی ہے۔
شعری تجربے زندگی کے احساسات تک پہنچادیتے ہیں۔
اُردو کی روایتی اور کلاسیکی شاعری نے 'گلشن'، 'باغ'، اور 'چمن'، کو محبوب بنانے کر رکھا ہے۔
یہ فارسی شاعری کی بہت بڑی دین ہے۔ اُردو شعراء نے اسے بار بار علامت، استعارہ اور

پیکر بنایا ہے اور اس کے تلازموں کی مدد سے اپنا شعری تجربہ پیش کیا ہے۔ باغ، گلشن اور چمن کے علاوہ غنچہ، شگوفہ، رنگ، پتا، بوٹا، کلیاں، بہار، خزان اور جانے کتنے پیکروں سے زندگی، محبوب اور حسن و عشق کے تجربوں میں چمک دمک پیدا کی ہے۔ میر تھی میر کی جمالیات میں بھی ان پیکروں کی بڑی اہمیت ہے۔ شرنگار رس کے شاعر نے گلشن اور باغ کو عزیز رکھا ہے اس لیے کہ یہ حسن و جمال کی علامت ہیں، زندگی کے حسن کا آئینہ ہیں، محبوب کے جمال کا عکس ہیں۔ میر کے دواوین میں سینکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں باغ اور اس کے تعلق سے شعری تجربے ملتے ہیں۔ اس وقت میں نے ان کے کم و بیش ۱۰۲ ایسے اشعار کو سامنے رکھا ہے کہ جن میں باغ، گلشن اور ان کے تلازموں سے زندگی اور عشق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایسے اشعار میں شرنگار رس کے پیش نظر یہ بات وثوق سے کبھی جاسکتی ہے کہ غم و الہم اور جمالیاتی انہساط دونوں کے تجربے ہیں۔ محبوب، غم اور اہبوکی طرح کلام میر میں باغ اور گلشن بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے حوالے سے بھی اپنے باطنی احوال و محركات کو پیش کیا گیا ہے۔ غالبت نے باغ، گلشن، گل وغیرہ کے اصطلاحی استعاروں کو بڑی عظمت بخشی ہے۔

کہتے ہیں:

باغ میں مجھ کونہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خون فشاں ہو جائے گا
(غالبت)

میں چشم و کشادہ و گھشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبِ نم خورشید دیدہ ہوں
(غالبت)

چمن چمن گلِ آئینہ در کنار ہوں
امیدِ محظی تماشائے گلتاں تجھ سے
(غالبت)

اسد ! یہ موسم گل در طسم گنج قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلتاں تجھ سے
(غالب)

نگہ گرم سے اک آگ نپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاک گلتاں مجھ سے
(غالب)

آئینہ خانہ ہے صحن چھنتاں یکسر
بس کہ میں بے خود وارفة و حرائیں گل و صبح
یہ تحریر کی ارفع جمالیات کی چند مثالیں ہیں۔ ”گریٹ ونڈر“ (Great Wonder) کے اس
شاعر نے گل، گلتاں اور گلتاں کے تلازموں میں جان پرور کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔
”شرنگار رس“ کے منفرد شاعر میر نے بھی باغ، گلشن اور ان کے تلازموں میں خوبصورت
تجربے پیش کیے ہیں جو انھیں اردو کی رومانی شاعری میں ممتاز درجہ عطا کرتے ہیں۔ اپنے
چند پسندیدہ اشعار پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

پتا پتا بونا بونا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ ایک بات ٹھہر جائے

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیکے پسینے میں

گل کو محبوب ہم نے قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

کچھ گل سے ہیں شلگفتہ کچھ سرو سے ہیں قدکش
اس کے خیال میں ہم دیکھیں ہیں خواب کیا کیا

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تمسم کیا

اس گل زمیں سے اب تک اُگتے ہیں سرو جس جا
مستی میں جھکتے جس پر تیرا پڑا ہے سایہ

میں بے دماغ عشق اُٹھا سو چلا گیا
بلبل پکارتی ہی رہی گلتاں کے نجع

اللہ رے عند لیب کی آوازِ دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہاں ان نے ہائے گل

گھپیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل
میں انھیں اردو شعریات میں اعلیٰ اور عمده تجربوں سے تعبیر کرتا ہوں۔

میر صاحب نے فارسی اور اردو شعراء کی طرح باغ، گلشن کو دنیا کا آئینہ بنایا ہے، باغ ان کے لیے بھی تجربوں کا ایک شہر ہے۔ انھوں نے بھی باغ گلشن کی رومان پرور فضائیں عشق اور اس کی خوبیوں کے ذکر کو ضروری جانا ہے۔ گلشن کے جلوے محبوب کے جلوے ہیں، آتشِ گل سے عاشق پہنک جاتا ہے۔ ”گل“ محبوب کا پیکر بھی ہے، اس سے مخاطب ہونا محبوب سے مخاطب ہونا ہے، کبھی گل کا جلوہ قریب کھینچتا ہے تو قریب جا کر محسوس ہوتا ہے اس میں وہ خوبیوں میں جو محبوب کے بدن میں ہے۔ شرنگار رس کے اس شاعر نے گلتاں کے تجربوں کی ایک دنیا سامنے رکھ دی ہے۔

کہتے ہیں سر پر سودا کا داغ ابھی تو غنچہ بنا ہوا ہے، یہ غنچہ کھلا کب ہے، جب دیوانگی بڑھے گی تو غنچہ پھول بنے گا، اس کی بہار آئے گی، دیوانگی کا سچا لطف حاصل ہو گا:

غنجپہ بے سر پہ داغ سودا کا
دیکھیں کب تک یہ گل بھار کرے

یہ خوبصورت شعر سنئے:

عرصہ دشت قیامت باغ ہو جائے گا سب
اس طرح سے جو یہ چشم خون فشاں میں لے گیا

آنکھوں سے ہو جاری ہے، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میں چشم خون فشاں لیے ہی اس
دنیا سے گزر جاؤں گا اور قیامت کے روز حشر کے میدان میں ہر جانب میرا ہو ہی بہتا نظر
آئے گا۔ میدانِ حشر ہو ہو ہو جائے گا۔

یہ کتنا دلفریب شعر ہے:

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلِ برگ
نک ہونٹ ہلا تو بھی کہ ایک بات خہر جائے

محبوب کے ہونٹ کو کوئی یاقوت کہتا ہے اور کوئی گلِ برگ۔ یقین سا ہے جیسے کہ یہ
یاقوت ہے اور نہ گلِ برگ، ان دونوں کے حسن و جمال سے کہیں آگے کوئی معجزہ ہے۔ یہ جلوہ
ہی اور ہے، اس کا جمال اپنی پراسراریت کا احساس دلارہا ہے۔ یاقوت یا گلِ برگ ہے تو
اس میں حرکت یا جنبش ہی پیدا نہیں ہوگی، یقین سا ہے کہ یہ ہونٹ جنبش کرے گا، جب اس
میں جنبش ہوگی تب ہی اس کا سحر یا معجزہ سامنے آئے گا۔ ”نک ہونٹ ہلا“ تاکہ قیاس آرائی
ختم ہو اور سچا حسن سامنے آجائے۔ یہاں گلِ برگ بھی یاقوت کی طرح حسن کا استعارہ
ہے۔ لیکن اس استعارے سے بہت آگے بھی ایک دلکش پراسرار استعارے کا احساس پیدا
کیا گیا ہے۔ ایک عام تجربے کو کتنا لکش بنادیا ہے:

چراغاں گل سے ہے کیا روشنی
گلتاں کسو کی قدم گاہ ہے

گلتاں گل کی روشنی سے چراغاں کی کیفیت کب پیدا کر سکتی ہے، یہ تو محبوب کے وجود

کی روشنی کا کرشمہ ہے کہ جس سے گلستان میں چراغاں ہو گیا ہے، گلستان محبوب کی قدم گاہ
ہے ورنہ پھولوں کا اپنا جلوہ کہاں ہوتا، پھولوں میں جور روشنی ہے وہ بھی محبوب کے وجود کی
روشنی کا عکس ہے۔

گلستان اور اس کے تلازموں کے پیش نظر ان اشعار پر غور کیجیے:

کچھِ موئِ ج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شايد کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

سیر کی رنگیں بنیاضِ باغ کی ہم نے بہت
سرد کا مصرع کہاں، وہ قامتِ موزوں کہاں

اب کہ ہزار رنگ گلستان میں آئے گل
پر اس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گل

ناچار ہو چمن میں نہ رہئے کہوں ہوں جب
بلبل کہے ہے اور کوئی دن برائے گل

کیا سمجھے لطف چہروں کے رنگ و بہار کا
بلبل نے اور کچھ نہیں دیکھا سوائے گل

تحا وصف ان لبوں کا زبانِ قلم چہ میر
یا منہ میں عند لیب کے تھے برگ ہائے گل

کوئی بھلی کا ٹکڑا اب تک بھی
پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں

اب کے بہت ہے شور بھاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس تک ہم بھی نکالیں دھو میں ہم کو مچانے دو

شہر چمن سے کچھ کم دشت جنوں نہیں ہے
یاں گل ہیں رستہ رستہ واں باغ دستہ دستہ

کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پر تیر
آتا ہے برگ گل کبھو کوئی صبا کے ساتھ

لیتی ہے ہوا رنگ سراپا سے تمہارے
معلوم نہیں ہوتے ہو گزار میں صاحب

کچھ بات ہے کہ گل تر نگیں وہاں سا ہے
یار نگ لالہ شوخ ترے رنگ پاں سا ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

جائے روغن دیا کرے ہے عشق
خون بلبل چراغ میں گل کے

سر و لب جو والہ و گل نسرين و سمن ہیں شکوفہ ہے
دیکھو جدھر باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

پھول اس چمن کے دیکھتے کیا کیا جھٹرے ہیں ہائے
سیل بہار آنکھوں سے میری روایا ہے اب

گل لے گئے تھے یار، میں بھی چمن کے پیچ
اس کی سی بو نہ آئی گل و یا سمن کے پیچ

گل کی تو بو سے غش نہیں آتا کسو کے تیس
بے فرق میر پھول کی اور اس کی بو کے پیچ

اس کے رنگ کھلا ہے شاید کوئی پھول بہار کے پیچ
شور پڑا ہے قیامت کا ساچا طرف گزار کے پیچ

یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے
گل میں رگیں نہیں یہ، ہیں نقش پائے بلبل

آئی بہار و گلشنِ گل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشہ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

کر سیر جذب الفت گلچیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخِ گل کو نگلی صدائے بلبل

بہار آئی کھلے گل پھول شاید باعِ صحرا میں
جھلک سی مارتی ہے کچھ سیاہی داعِ سودا میں

شاید بہار آئی ہے دیوانہ ہے جوان
زنجر کی سی آتی ہے جھنکار کان میں

گل و آئینہ ۱۲ خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا مذھر تیرا ہی رو تھا

صد گلتان تھے یک بال تھے اس کے جب تک
طاہر جاں قفسِ تن کا گرفتار نہ تھا

جس چمن زار کا ہے تو گلِ تر
بلبل اس گلتاں کے ہم بھی ہیں

صحیح ہوئی گلزار کے طارِ دل کو اپنے ٹھولیں ہیں
یاد میں اس خود روگلِ تر کی کیسے کیسے بولیں ہیں

اچھی لگے ہے تجھ بن گلشت باعث کس کو
صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو

تری گلشت کی خاطر بنائے ہے باعث داغوں سے
پر طاؤس سینہ ہے تمای دست گل دستہ

چلتے ہو تو چمن کو چلنے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں، کم کم بادو باراں ہے

دل بند ہے ہمارا موج ہوائے گل سے
اب کے جنوں میں ہم نے زنجیر کیا نکالی

پھر اس نے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے
کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

بھڑکے ہے آتشِ گل اے ابرِ تر ترجم
گوشے میں گلتاں کے میرا بھی آشیاں ہے

کل تک ہم نے تم کو رکھا تو پرے میں کلی کے رنگ
صحیح شگفتہ گل جو ہوئے تم سب نے کیا نظارا آج

اب کی بالیدن گل ہا تھا بہت دیکھونہ تیر
ہمسر لالہ ہے خار سر دیوار ہنوز

رنگ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

کی سیر ہم نے سینہ یکسر فگار کی
اس تنخے نے بھی اب کے قیامت بھار کی

شب گئے تھے باغ میں ہم ظلم کے مارے ہوئے
جان کو اپنی گل مہتاب انگارے ہوئے

چراغاں گل سے ہے کیا روشنی
گلتاں کو کی قدم گاہ ہے

اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا
ہزار مرغ گلتاں مجھے پکارے ہے

ان اشعار میں احساسِ حسن بھی متاثر کرتا ہے اور افرادگی کا احساس بھی دل کو چھوتا ہے۔ بعض اشعار بہت لطیف اور دلنوواز ہیں، جذبے کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ یہ اشعار بھی سوز و گداز سے بھرے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں بڑی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اشعار

بیک وقت غم انگیز اور مسرت بخش ہیں۔

باغ، گلستان یا چمن زندگی اور عشقیہ تجربوں کی ایک رنگیں دُنیا ہے، میر صاحب کی سائیکی میں اس علامت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ شاعر کے تخلیقی عمل کا ایک اہم دائرہ ہے جہاں بہار، خزاں، رنگ، شگوفہ، پتا، بوٹا، گل، کلیاں، غنچہ، گل، موسم گل، ابر بہار، زنجیر، شاخ، پودے، رنگ گل، بلبل سب محترک پیکر بنتے ہیں۔ اس کا ایک حسن جنوں پیدا کرتا ہے اور اس کا اپنا حسن محبوب کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے اور اس کا اپنا کوئی حسن ہی نہیں ہوتا، وہ تو محبوب کا حسن ہے جو اسے حسین اور خوبصورت بناتا ہے۔ چمن، محبوب کے حسن کا آئینہ بھی ہے۔ شاعر کی سائیکی میں باغ یا گلشن المیہ تصادم یا المناک کشمکش کا مقام بھی ہے، میر کے کلام میں جو المیہ جذبات ابھرے ہیں ان کا رشتہ گلشن یا باغ کے وسیع دائے ساقائم ہے۔ عاشق کی ذہنی کیفیتوں کے مطالعے میں ان جذبات کا مطالعہ بڑی مدد کرتا ہے۔ یہاں فرد کی افیمت ناک زندگی (Acute Suffering) کے تجربے بھی ہیں اور مسرت اور انبساط کے بھی۔ گلستان وہ اشیج ہے کہ جہاں صرف دو مرکزی کردار ہیں، عاشق اور محبوب، رقیب کا وجود محسوس ہی نہیں ہوتا۔ صرف دو کرداروں کے عمل پر پورے ڈرامے کا حسن منحصر کرتا ہے۔ گلستان یا چمن میں عاشق کے جنوں کی مرسی بھی کم نہیں ہے۔ اسی طرح حسن و جمال سے لطف انداز ہوتے ہوئے مستقیب بھی کم نظر نہیں آتی۔ ان اشعار میں بھی احساس اور تخيّل دونوں اہمیت رکھتے ہیں۔ جذبوں سے لطف انداز کرنے کی جو صلاحیت میر صاحب میں ہے وہ کسی کو نصیب نہیں ہے۔ عشقیہ تجربوں کے آہنگ (Rhythm) اور 'ہارمونی' (Harmony) دونوں کا تاثر گہرا ہوتا ہے۔ چمن، گلستان یا باغ کے تجربوں سے بھی ایک عمدہ جمالیاتی معیار سامنے آتا ہے۔

شکیل الرحمن کی مندرجہ ذیل کتابیں

آن کے ویب سائٹ پر پڑھی جاسکتی ہیں:

۱. رومی کی جمالیات
۲. محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات
۳. کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات
۴. منظو شناسی اور شکیل الرحمن
۵. اساطیر کی جمالیات
۶. منٹو۔ ٹریجیدی کی جمالیات
۷. اختراالایمان۔ جمالیاتی لیجنڈ
۸. فراق کی جمالیات
۹. پریم چنڈ اور شکیل الرحمن
۱۰. دربھنگ کا جو ذکر کیا
۱۱. تصوف کی جمالیات
- ۱۲.. ادب اور جمالیات
- ۱۳.. فیض کی جمالیات
۱۴. آشرم (خودنوشت سوانح حیات)
۱۵. میر کی جمالیات

Website:

www.shakeelurrehman.com

E-mail:

shakeelrehman2001@hotmail.com

شکیل الرحمن کی کتابیں

- ہندوستان کا نظامِ جمال: بدھ جمالیات سے جمالیاتِ غالب تک (جلد دوم)
- ہندوستان کا نظامِ جمال: بدھ جمالیات سے جمالیاتِ غالب تک (جلد سوم)
- ہندوستانی جمالیات (جلد اول)
- ہندوستانی جمالیات (جلد دوم)
- ہندوستانی جمالیات (جلد سوم) (بند اسلامی جمالیات)
- قرآن حکیم: جمالیات کا سرچشمہ (مقدمہ)

چند دوسرے موضوعات

- راگ رائگنیوں کی تصویریں • ابوالکلام آزاد
- جپ جی صاحب (معہ مقدمہ و مفہوم)
- درجتنے کا جوڑ کر کیا • محمد اقبال

شکیل الرحمن پر کتابیں

- شکیل الرحمن: ایک لیجنڈ
— ترتیب و تہذیب: شعیب شس
- شکیل الرحمن: تخلیقی تنقید کا ایک منفرد و بستان
— اقبال انصاری
- شکیل الرحمن: تنقید کا ایک نیا وہن
— مرتبہ: محمد صدیق نقوی
- شکیل الرحمن اور مولا نارومی کی جمالیات
— مرتبہ: محمد صدیق نقوی
- شکیل الرحمن کی غالب شنائی
— ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی
- منشوشاں اور شکیل الرحمن
— مرتبہ: ڈاکٹر کوثر مظہری
- فکشن کے فنکار پریم چندا اور شکیل الرحمن
— مرتبہ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
- شکیل الرحمن کا جمالیاتی وجدان
— حفائل القاسمی

کلاسیکی ادب

- اساطیر کی جمالیات
- مولا نارومی کی جمالیات
- جمالیات حافظ شیرازی
- امیر خرد کی جمالیات
- کبیر
- نظریا کیر آبادی کی جمالیات
- میر تقی میر کی جمالیات
- تصوف کی جمالیات
- کلاسیکی منشوشاں کی جمالیات
- محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات
- ادب اور جمالیات مرتبہ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

فکشن

- داستان امیر حمزہ اور طسم ہوش ربا
- فکشن کے فنکار: پریم چنڈ
- منشوشاں
- احمد ندیم قاسمی - ایک لیجنڈ (مطبوعہ پاکستان)

غالبیات

- مرزان غالب اور ہندل مغل جمالیات
- رقص بتان آذری
- غالب کا داستانی مزاج (مطبوعہ پاکستان)
- غالب اور مغل مصوری (مطبوعہ پاکستان)
- غالب کی جمالیات

خود نوشت سوانح حیات

- آشرم

جمالیات

- ہندوستان کا نظامِ جمال: بدھ جمالیات سے جمالیاتِ غالب تک (جلد اول)



• ”عشقیہ شاعری میں میر صاحب نے جو لطیف پر اثر اور دلفریب فضائل خلق کی ہے اس میں ان کے مہم اور دلنشیں لمحے کی بڑی اہمیت ہے، اس لمحے میں کبھی کبھی برق کی سی جو لہر ملتی ہے وہ شخصیت کے سوز و گداز کی دین ہے، شریزگار رس لیے یہ شاعری عشقیہ تجربوں کا عرفان بخششی ہے۔ میر کی عشقیہ شاعری میں فراق کی اذیتیں ہیں، تمباو کے کچل جانے کے احساسات ہیں، سوز و گداز اور درون بنی ہے۔ خود فراموشی کی کیفیت ہے، واردات قلب کا بیان ہے، ایسے تمام حسی تجربوں میں عام انسانی تجربے ملتے ہیں، جمالیاتی عشقیہ تجربوں میں اکثر ایسی جدت ملتی ہے جس کی تازگی متاثر کرتی ہے۔“

— شکیل الرحمن